



ہندوستان و پاکستان دونوں جگہ
قیمت فی کاپی ۱۰

سالانہ چندہ پاکستان و ہندوستان
آٹھ روپیہ (مع سالنامہ)

تصانیف نیاز فچتوری

ہندو مسلم نزاع کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دینے والی

انجیل انسانیت

من ویز داں

مذہبی استفسارات و جوابات

کا
مجموعہ

اس مجموعہ میں جن مسائل پر حضرت نیاز نے روشنی ڈالی ہے ان کی مختصر فہرست یہ ہے: اصحاب کہف، معجزہ و کرامت، انسان مجبور ہے یا مختار، مذہب و عقل، طوفان نوح، خضر کی حقیقت، مسیح علم و تاریخ کی روشنی میں، یونس اور بارہون، حسن یوسف کی داستان، تارون سامری، علم غیب، دعا، توبہ، لقمان، عالم برزخ، یاجوج ماجوج، باروت، جہنم کوثر، امام مہدی، نور محمدی اور بل صراط، آتش نرود وغیرہ ضخامت ۲۲۳ صفحات کاغذ سفید دبیر۔

قیمت پانچ روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

مولانا نیاز فچتوری کی ہم سالہ دو تصنیفات صحافت کا ایک غیر فانی کارنامہ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کر کے تمام نوع انسانی کو انسانیت کبریٰ و اخوت عامہ کے ایک رشتہ سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے جس میں مذاہب کی تخلیق، دینی عقائد و رسالت کے مفہوم اور صحائف مقدسہ کی حقیقت پر تاریخی، علمی، اخلاقی اور نفسیاتی نقطہ نظر سے نہایت بلند انشاء اور پُر زور خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے۔

قیمت سات روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

ترغیبات جنسی یا

شہوانیات مجلد

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات پر تاریخی و نفسیاتی حیثیت سے نہایت شرح و بسط کے ساتھ متفقانہ تبصرہ کیا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس طرح رائج ہوئی نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اس کے رواج میں کتنی مدد کی، اس کتاب میں آپ حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے۔

علاوہ محصول

حسن کی عیاریاں

اور دوسرے افسانے

حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ جس میں تاریخ اور انشائیہ کا بہترین امتزاج آپ کو نظر آئے گا اور ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہوگا کہ تاریخ کے بھولے ہوئے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ تھیں جنہیں حضرت نیاز کی انشاء نے اور زیادہ دل کش بنا دیا ہے۔

قیمت دو روپیہ

علاوہ محصول

جمالستان

ایڈیٹر نگار کے افسانوں اور مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں حسن بیان و ندرت خیال اور پاکیزگی زبان کے بہترین نمونے کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشرتی مسائل کا حل بھی نظر آئے گا ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ حجاز ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس ایڈیشن میں متعدد افسانے اضافہ کئے گئے ہیں جو پہلے ایڈیشنوں میں نہ تھے۔

قیمت

پانچ روپیہ آٹھ آنے

علاوہ محصول

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجہ قبول حاصل کیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد معنائیں غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔ اس ایڈیشن میں متعدد افسانے اور ادبی مقالات ایسے اضافہ کئے گئے ہیں جو پہلے ایڈیشنوں میں نہ تھے۔ اس لئے ضخامت بھی زیادہ ہے۔

قیمت

چار روپیہ

علاوہ محصول

۵۵ سال کا سالنامہ

(علماء اسلام نمبر)

سال گزشتہ میں مے سالنامہ ۱۹۵۴ء کا ذکر کرتے ہوئے ظاہر کیا تھا کہ "فرانز وایان اسلام" نمبر کے بعد میں "علماء اسلام" اور "اماکن اسلام" کا سلسلہ شروع کروں گا تاکہ اس طرح رفتہ رفتہ دو سالہ سال میں "تاریخ اسلام" کا وہ باب جو ترقی علوم و فنون سے متعلق ہے مکمل ہو جائے، چنانچہ اس کا ایک حصہ "فرانز وایان اسلام" آپ کی نگاہ سے گزر چکا اور اب آئندہ سال کے لئے اس سلسلہ کا دوسرا حصہ پیش نظر ہے جو "علماء اسلام" سے تعلق رکھتا ہے۔

اس خاص نمبر میں عرب، ایران، ایتھن، عجم، ہندوستان وغیرہ کے ان تمام اکابر علم و ادب کا ذکر کیا جائے گا جنہوں نے کسی خاص فن یا شعبہ علم کی کوئی نمایاں خدمت انجام دی ہے اور کوئی نہ کوئی تصنیف اپنے بعد چھوڑ گئے۔ اس سالنامہ کی ترتیب میں حسب ذیل امور کا خاص لحاظ رکھا جائے گا:-

- ۱۔ پورا نام معد ولدت و کنیت وغیرہ کے
 - ۲۔ تاریخ ولادت و وفات سنہ ہجری و سنہ عیسوی کے مطابق کیسیا
 - ۳۔ مختصر حالات زندگی اور خاص خاص کارنامے
 - ۴۔ اہم تصانیف کی فہرست
 - ۵۔ حوالہ جات جن سے یہ معلوم ہو سکے گا کہ تاریخ کی کون کون کتابوں میں ان کا ذکر موجود ہے
 - ۶۔ ایک اندکس حروف تہجی کے لحاظ سے اور دوسرا علم و فن یا زمانہ کے لحاظ سے
- اس خاص نمبر میں عہد نبوی سے لیکر عہد حاضر تک کے تمام ماہرین تفسیر و قرآن، ائمہ حدیث، فقہاء، حکماء، اطباء، شہکلمین ماہرین لسانیات و ادب، علماء فلکیات و ریاضیات، طبیعیات و نفسیات، علماء تاریخ و جغرافیہ، سوانح نگاروں اور سیاحوں کا ذکر کیا جائے گا۔

نیاز

پاکستان میں نگار اور مطبوعات نگار

ان پتوں سے حاصل کیجئے

- ۱۔ کتاب محل کراچی
- ۲۔ اقبال بک ڈپو کراچی
- ۳۔ ہاشمی بک ڈپو - ۱۹۱۰ - الہی بخش کالونی، کراچی
- ۴۔ کتاب محل راولپنڈی
- ۵۔ مکتبہ جدید لاہور

اگرہ اتک کسی ماہ کا پرچہ آپ کو ملے

تو اطلاع ملنے پر آئندہ ماہ کے پرچہ کے ساتھ ہم اپنے صرف سے فراہم کر دیں گے۔ لیکن اگر آپ اس سے قبل چاہیں گے تو بزرگ دانہ ہوگا (کیونکہ مہینہ کے اندر اندر پیڈ بھیجنے میں ہم کو ہنگنا محمول ڈاک ادا کرنا ہوگا) اس لئے جب آپ پرچہ نہ پہنچنے کی اطلاع دیں تو یہ ضرور لکھ دیجئے کہ آپ فوراً چاہتے ہیں یا اگلے پرچے کے ساتھ۔

منیجر نگار لکھنؤ

داعی طرف کا صلیبی نشان علامت ہے "نگار" آٹھ روپیہ آٹھ آنے میں دی پی ہوگا اس امر کی کہ آپ کا چندہ اپریل میں ختم ہو گیا اور مئی کا جس میں سالنامہ شہد کی قیمت بھی شامل ہے

نگار

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

جلد ۶۵	فہرست مضامین اپریل ۱۹۵۷ء	شمار ۴
--------	--------------------------	--------

۲	ملاحظات	۴۳	جنت سے نکل کر
۵	غائب اور میرٹھ	۴۸	گاہے گاہے باز خواں (خدا کا صحیح تصور)
۱۲	نئی شاعری میں کلاسیکی عناصر	۵۱	دین الہی کا پس منظر
۲۰	عہد مغلیہ کے باغ و راز	۵۵	منظومات
۳۲	ایران کی جدید شاعری اور امن و صلح کا موضوع	۵۶	رباعیات رضوی

ملاحظات

مسلمان کیا کریں

"جناح، مسلم لیگ اور پاکستان" یہ تینوں لفظ پاکستان میں بڑی تاریخی و مذہبی حیثیت رکھتے ہیں۔ جناح نے مسلم لیگ کو زندہ کیا۔ مسلم لیگ نے پاکستان بنایا اور پاکستان نے مسلمانوں کو دارالسلام عطا کیا۔ پاکستان کی طرح ہندوستان میں بھی اسی قسم کے تین الفاظ کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ گاندھی جی۔ کانگریس اور بھارت، گاندھی جی نے کانگریس کو قوت بخشی۔ کانگریس نے ہندوستان کو آزادی دلائی اور ہندوستان کی آزادی نے ہندوؤں کو ایک حکمران قوم ہونے کا جذبہ بخشا۔ فرق صرف یہ ہے کہ پاکستان میں قائد اعظم کی وفات کے بعد مسلم لیگ عملاً مردہ ہو گئی اور ہندوستان میں گاندھی جی کی وفات کے بعد کانگریس میں تفریق تو ضرور پیدا ہو گئی لیکن وہ عملاً ابھی تک زندہ و سلامت ہے۔ حکومت کی نوعیت کو دونوں جگہ مختلف ہے یعنی پاکستان مذہبی حکومت ہے اور بھارت غیر مذہبی لیکن حقیقت یہ ہے کہ پاکستان باوصف اس ادعا کے کہ وہ مذہبی حکومت ہے، مذہب سے کوئی تعلق نہیں رکھتا اور ہندوستان غیر مذہبی حکومت ہونے کے باوجود بدستور مذہب کی وحدانیت میں مبتلا ہے۔ یعنی پاکستان کا مسلمان تو اب تک مسلمان نہیں بن سکا لیکن ہندوستان کا مسلمان ہندوؤں کے نزدیک پہلے سے زیادہ مسلمان ہے۔

وائے گرو درپس امر دوز بود فردائے !

الغرض مسلمان اس وقت نہایت عجیب و غریب دور سے گزر رہا ہے۔ پاکستان کا مسلمان یہ سوچ رہا ہے کہ اگر اسے خدا نہیں ملا تھا تو نہ ملتا، ”وصالِ صنم“ تو ہو جاتا، لیکن وہاں یہ بھی نہ ہوا اور جس اقتصادی برعالی میں وہ تقسیم ہند سے قبل مبتلا تھا، تقسیم کے بعد بھی بدستور اس میں مبتلا ہے۔ ہندوستان کا مسلمان سوچ رہا ہے کہ ہندوستانی بنے رہنے کے بعد بھی وہ غیر ہندوستانی سمجھا جاتا ہے اور عام طور پر ہندو آبادی بھارت میں اس کے قیام کو پسند نہیں کرتی

پھر کیا کیا جائے؟ اس سوال کا جواب آسان نہیں۔ اب سے چار پانچ سال قبل تو خیر یہ سوال ہی ہمارے سامنے نہ تھا کہ ہم یہاں رہیں تو کیونکر رہیں کیونکہ ہم میں سے اکثر پاکستان ہی کا خواب دیکھ رہے تھے، لیکن اب صورت حال مختلف ہے۔ اکثر مسلمان پاکستان جانے کا خیال ترک کرتے جا رہے ہیں (شاید اس لئے کہ وہاں ان کے لئے کوئی گنجائش نہیں) اور اب وہ زیادہ سنجیدگی سے سوچنے لگے ہیں کہ اگر وہ یہاں رہیں تو زندگی کیونکر بسر کریں۔ مسلمانوں کی عام اقتصادی حالت تقسیم ہند سے پہلے بھی اچھی نہ تھی، لیکن زندگی خیر کسی طرح بسر ہو رہی تھی۔ نوکریاں، چھوٹے موٹے کاروبار، تھوڑی بہت زمینداری، زیادہ تر یہی ذرائع زندگی تھے، لیکن اب یہ تینوں صورتیں باقی نہیں رہیں۔ نوکری کا دروازہ ان کے لئے بند ہے اور اگر کھلا ہو تو بھی کتنے اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں، زمینداری ختم ہو چکی، رہ گیا کاروبار سو اول تو اس کے لئے سرمایہ پاس نہیں اور اگر ہو بھی تو ان کی ہمت افزائی کون کرے۔ اسی کے ساتھ ایک بڑی دشواری اور ہے جو ان تمام دشواریوں سے زیادہ ہمت شکن ہے اور وہ یہ کہ یہاں کے مسلمان حال کی طرف سے اس قدر فکر مند نہیں ہیں جتنے اپنے مستقبل کی طرف سے ہیں۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم تو خیر جس طرح ہو گا نباہ لے جائیں گے، لیکن ہماری اولاد کا یہاں کیا حشر ہو گا

میں نے ان سے پوچھا کہ پہلے یہ فکر کیوں نہیں تھی، اس کا جواب انھوں نے یہ دیا کہ پہلے ہمارے بچوں کی ابتدائی تعلیم مادری زبان میں ہوتی تھی، ثانوی و اعلیٰ تعلیم انگریزی میں ہوتی تھی جو بڑی وسیع علمی زبان ہے اور اس طرح تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد کچھ تو نوکریاں حاصل کر لیتے تھے اور کچھ کافی باخبر و باہوش ہو جانے کی وجہ سے معاش کے دوسرے ذرائع اختیار کر سکتے تھے لیکن اب اس کا امکان نہیں، کیونکہ نوکریاں ان کو مل نہ سکیں گی اور ذہنی تربیت نہ ہونے کی وجہ سے وہ یوں بھی کسی قابل نہ ہوں گے

یہ ہیں وہ خیالات جو آج کل مسلمانوں کو زیادہ پریشان کیے ہوئے ہیں اور اگر ان کے یہ اندیشے صحیح ہیں تو ہم کو غور کرنا چاہئے کہ وہ دور ہو سکتے ہیں یا نہیں۔ اصل یہ ہے کہ انسان زندگی کے ہر مسئلہ کو اقتصادی نقطہ نظر سے دیکھنے پر مجبور ہے، یہاں تک کہ خدا کی حضوری میں بھی وہ — ”چہ خور و باداد فرزندم“ — کی فکر سے آزاد نہیں ہوتا، چنانچہ بچوں کی تعلیم کے سلسلہ میں بھی ہندوستان کا مسلمان یہی سوچتا ہے کہ اگر ان کی تعلیم اچھی نہ ہو سکی تو آئندہ وہ اپنا پیٹ کیونکر پالیں گے؟ یہاں تک تو رفتار خیال بالکل صحیح ہے لیکن اس سے آگے بڑھ کر جب یہ سوچا جاتا ہے کہ انھیں نوکریاں کیونکر ملیں گی تو میں اختلاف پر مجبور ہو جاتا ہوں، کیونکہ دنیا میں روزی کمانے کا انحصار صرف حکومت کی نوکری پر نہیں ہے اور اگر تعلیم کا مقصود یہی قرار پائے تو اس سے زیادہ جہل کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا زندگی کے اقتصادی پہلو کو سنوارنے کے لئے ضرورت ہے صرف عملی تعلیم کی، قواعد عملیہ میں حرکت اور اسی کے ساتھ ارادہ میں مضبوطی پیدا کرنے کی اور جب اس لحاظ سے ہمارے مدارس اور ہمارے یونیورسٹیاں بالکل بیکار ہیں تو پھر یہ فکر فضول ہے کہ تعلیم ہندی میں ہوتی ہے یا اردو میں کیونکہ جب نصاب تعلیم ہی سرے سے ناقص ہے تو ہندی کے مہاشا اور اردو کے فاضل دونوں کا ایک ہی حشر ہونا ہے۔ اس لئے مسلمانوں نے جو تصور تعلیم کا قائم کیا ہے اور اس کے ذریعہ سے حصول ملازمت کا جو مقصود قرار دیا ہے، وہ حد درجہ گمراہ کن ہے اس حقیقت کو اب مرکزی حکومت نے بھی محسوس کیا ہے اور وہ موجودہ کتابی نصاب کے ساتھ ساتھ عملی تعلیم کو بھی وسیع پیمانہ پر رائج کرنا چاہتی ہے، لیکن مسلمانوں کو نہ اس کا انتظار کرنا چاہئے اور نہ اس پر زیادہ اعتماد بلکہ خود اپنے قومی مدارس قائم کر کے اپنی ضرورتوں کو پورا کرنا چاہئے

اگر سرکاری مدارس میں ابتدائی تعلیم مادری زبان میں نہیں ہوتی تو انھیں خود اجتماعی طور پر محالہ محلہ شہینہ وغیرہ شہینہ مکاتب قائم

کر کے ابتدائی تعلیم و اخلاقی تربیت کا انتظام کرنا چاہئے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہم شکوہ و شکایت چھوڑ کر خود اپنی قوت سے آگے بڑھنے کی کوشش کریں

میں اس کا مخالف ہوں کہ اس نوع کے سماجی مسائل کو سیاسیات میں شامل کیا جائے اور خواہ مخواہ حکومت سے ایسی باتوں کا مطالبہ کیا جائے جن کا پورا کرنا اس کے اختیار سے باہر ہے اور اگر ایسا نہ ہو تو بھی مسلمان اس سے زیادہ فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ اس میں شک نہیں کہ ہندوؤں کی بڑی جماعت مسلمانوں کی روادار نہیں، لیکن میں یہ ماننے کے لئے تیار نہیں کہ ان کی یہ ذہنیت ہمیشہ ایسی ہی قائم رہے گی اور مسلمان اپنے طرز عمل سے اس ذہنیت کے بدلنے پر قادر نہیں ہیں۔

مشرقی بنگال میں مسلم لیگ کی شکست
اور اس کے دور رس نتائج

کے لئے ضرور دور ہو جاتا ہے
ہو سکتا ہے کہ پاکستان کے موجودہ ارباب حکومت مسلم لیگ کے نایزہ ہوں، لیکن پاکستانی عوام کی نمایندگی قطعاً انہیں حاصل نہیں ہے اور یہی وہ چیز تھی جس نے مسلم لیگ کے خلاف متعدد جماعتیں وہاں قائم کر دیں۔ پھر مغربی پاکستان میں تو مسلم لیگ کا یہ ڈھونگ کچھ دنوں تک قائم رہا، لیکن مشرقی بنگال جو مرکزی حکومت کی غلط اقتصادی پالیسی کی وجہ سے غیر معمولی مصائب کا شکار ہو رہا تھا، زیادہ عرصہ تک اس کو برداشت نہ کر سکتا تھا اور آخر کار اس نے مسلم لیگ کا تختہ الٹ کر رکھ دیا۔ پاکستان کے رجحانات کچھ عرصہ سے حد درجہ غیر جمہوری ہو گئے ہیں اور وہاں کی حکومت صرف جماعت اشراف کی حکومت ہو کر رہ گئی ہے جس کا سب سے بڑا ثبوت وہ فوجی معاہدہ ہے جو امریکہ کے ساتھ ہونے والا ہے۔ ہر چند عوام کو یہ سمجھایا جاتا ہے کہ اس سے ان کی اقتصادی برعالی و بیروزگاری دور ہو جائے گی اور دور فراغت و خوشحالی پھر عود کر آئے گا، لیکن عوام اس حقیقت سے بے خبر نہیں کہ امریکی امداد سے اگر کسی کو فائدہ پہنچ سکتا ہے تو وہ صرف وہاں کے امراء و سرمایہ دار ہیں اور عوام تک امریکی ڈالر کی برکات کبھی نہیں پہنچ سکتیں

مشرقی بنگال نے خصوصیت کے ساتھ اس کو زیادہ محسوس کیا کیونکہ اسے نہ مشرق وسطیٰ کے مسائل سے زیادہ دلچسپی ہے اور نہ وہ پاکستان کی موجودہ دفاعی پالیسی سے فائدہ اٹھانے کی توقع کر سکتا ہے۔ رہ گئی مرکز کی مالیاتی پالیسی سو وہ پہلے ہی سے اس کا مخالف تھا کیونکہ پاکستان نے سکے کی قیمت میں کمی نہ کر کے وہاں جوٹ کی تجارت کو سخت نقصان پہنچا رکھا ہے جس پر انکی معاشی زندگی کا انحصار ہے۔ چنانچہ فضل الحق اور سہروردی کی جماعت مسلم لیگ کو شکست دینے میں اسی لئے کامیابی ہوئی کہ انھوں نے شرح تبادلہ کو اعتدال پر لانے اور بین الاقوامی دشواریوں کو دور کرنے کا وعدہ عوام سے کیا تھا۔ بہر حال مشرقی بنگال اور مغربی پاکستان کے درمیان بعد مکانی کے علاوہ اب ایک اور بُعد پیدا ہو گیا ہے اور چونکہ اس کا تعلق آئڈیا لوجی سے ہے اس لئے اب ان دونوں کا اتحاد اس وقت تک ممکن نہیں جب تک مغربی پاکستان کی موجودہ پارلیمنٹ میں کوئی غیر معمولی تبدیلی پیدا نہ ہو چنانچہ متحدہ محاذ نے اس دلیل کی بنیاد پر کہ وہ پاکستان کی ۵۰ فی صدی آبادی کی نمایندہ ہے، مرکزی پارلیمنٹ سے مجلس دستور ساز کے توڑ دینے کا مطالبہ کیا ہے اور چونکہ پارلیمنٹ اور مجلس دستور ساز ایک ہی چیز ہیں اس لئے یہ مطالبہ گویا پارلیمنٹ کے توڑ دینے کا مطالبہ ہے۔ اسی کے ساتھ جب ان اختلافات کو دیکھ رہے ہیں جو لاہور و کراچی میں رونما ہو رہے ہیں تو ہم ایسا محسوس کرتے ہیں کہ محمد علی کی موجودہ وزارت زیادہ چلنے والی نہیں اور اگر اس نے اپنے قیام کے لئے ضبط و تدبیر سے کام نہ لیا اور جذبات سے مغلوب ہو گئی تو پھر قوی اندیشہ اس امر کا ہے کہ پاکستان میں مفر کی طرح فوجی حکومت قائم ہو جائے اور یہ فوجی حکومت یقیناً امریکہ کا منہ دیکھنے والی نہ ہوگی۔

غالب اور میرٹھ

(سلسلہء سابق)

(۴)

غالب کی دقت پسندی مشہور ہے۔ ان کی زندگی میں ان کے مخالفوں نے ان کے کلام کو مہیں اور بے معنی بتایا اور آخر ان کو خطبہ کر کے مرزا نے کہا :-

گر نہیں میں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

میرٹھ کی سرزمین کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس کے ایک فرزند رشید مولوی احمد حسن شوکت نے مرزا کے اردو دیوان کی مکمل، واضح اور جامع قسم کی شرح کر کے ان کے نکتہ چینوں کو منہ توڑ جواب دیا اور بقول مولانا حسرت موہانی بعض بعض اشعار کے سات سات مطالب بیان کر کے تحقیق اور سخن فہمی کا حق ادا کیا۔

مولوی احمد حسن حضرت شیخ عبداللہ انصاری کی اولاد سے تھے۔ ان کے جد اعلیٰ شیخ سالار شاہ عالم بادشاہ کے عہد حکومت میں داروہند ہوئے۔ سہارن پور کے ضلع میں ایک چھوٹی سی بستی رام پور ہے۔ یہاں بادشاہ نے عقیدت کی بنا پر ایک جاگیر عطا کی۔ وہ اپنے اوقات علم کے لمحات یہاں خدا کی یاد میں گزارنے لگے۔ ان کا مزار آج بھی اس بستی میں مرجع خلائق ہے۔ مولوی احمد حسن مشائخ میں ہجرت کر کے میرٹھ آئے۔ یہ اپنے وقت کے مہجر عالم اور فارسی کے بہت بڑے ادیب و انشا پرداز تھے۔ شعر و سخن کا ذوق بھی تھا۔ شریعت کا بھی علم تھا۔ غالب کی طرح طبیعت میں تجدد کا زور تھا۔ ادبی اور لسانی مسائل میں مجتہدانہ شان رکھتے تھے۔ اس لئے عام طور سے مجدد السنہ شریعہ کے خطاب سے یاد کیا جاتا تھا۔ طوطی ہند اور شمعہ ہند دو معیاری رسالے نکالے جن میں علمی، ادبی، اور مذہبی ہر قسم کے مضامین ہوتے تھے ایک ماہانہ ”پروانہ“ کی عنان ادارت بھی ان کے ہاتھ میں تھی۔ ویسے تو یہ غزلوں اور نظموں کا گلہ استہ تھا۔ لیکن خاقانی، بیدل، عرفی اور عربی شاعر متنبی جیسے دقت پسند شعراء کے مشکل اشعار کا حل بھی اس رسالے میں ماہ بامہ شایع ہوتا تھا۔ اول اول غالب کے اشعار کا حل بالاقساط اس رسالے میں چھپا۔ بعد میں طلبہ اور عام اہل ذوق کی درخواست پر ۱۳۳۷ھ میں اس کو کتابی صورت میں شایع کر دیا گیا۔ مولانا کے ایک عزیز شاگرد چودھری گھنشیام سنگھ خاں نے ”حل دقایق الغالب“ سے تاریخ نکالی۔

سال تاریخ خاں نکتہ شناس گفتہ حل دقایق الغالب

مولانا شوکت نے دیباچے میں لکھا ہے :- ”از روئے کہ غالب جان بجا نادر سپرد تا دور سنین ما کے پادر شعلہ زار علی ثوانت ہند اس سے ثابت ہوتا ہے کہ والد حیدر آبادی کی شرح و ثوق صراحت جو ۱۸۹۷ء میں طبع ہوئی مولانا کی نظر سے نہیں گزری۔ ورنہ وہ کبھی یہ نہ لکھتے کہ غالب کی وفات کے بعد سے آج تک کسی کو اس شعلہ زار میں قدم رکھنے کی جرأت نہ ہوئی۔ اس کے علاوہ وثوق صراحت غالب کے کلام کا حل نہیں بلکہ تمام اشارے ہیں جن کی مدد سے بقول حسرت موہانی مولانا مرحوم شرح لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے۔“

(۵)

غالب کے شاگرد بے شمار ہیں۔ کوئی بستی ان سے خالی نہیں۔ میرٹھ نے بھی ان سے فیض اُٹھایا ان کی صحبت اور تربیت نے اس سرزمین کے جن جوہروں کو چمکایا ان میں سے تین قابل ذکر ہیں۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ، مولانا محمد اسماعیل، حکیم فصیح الدین رنج۔

نواب مصطفیٰ خاں فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ اول اول مومن خاں سے مشورہ سخن کیا۔ اس کے بعد غالب کو کلام دکھانے لگے۔ مولانا حالی بھی یہی کہتے ہیں۔ لیکن مرزا غالب کی ایک تحریر سے اس کے برعکس یہ ثابت ہوتا ہے کہ شیفتہ فارسی کلام شروع ہی سے مرزا کو دکھاتے تھے۔ چنانچہ ایک خط میں جو تفتہ کے نام ہے، غالب لکھتے ہیں :-

”اسرا اللہ خاں غالب کے شاگرد نواب مصطفیٰ خاں بہادر علاقہ دار جہانگیر آباد اردو میں شیفتہ اور فارسی میں حسرتی تخلص کرتے ہیں۔ اردو میں مومن خاں کو اپنا کلام دکھاتے تھے“۔

نواب صاحب شہرہ کے مشہور ہنگامے کے بعد میرٹھ چلے آئے تھے۔ اگرچہ جاگیر کے انتظام کے سلسلہ میں ان کا قیام سکندر آباد ضلع بلند شہر میں زیادہ رہا لیکن مستقل طور سے وہ میرٹھ ہی میں مقیم تھے۔ چنانچہ غالب جب میرٹھ گئے تو نواب صاحب کے ہاں فروکش ہوئے۔ ہنگامے سے پہلے ان کا شمار بڑے جاگیرداروں میں تھا۔ اردو شعراء کا ایک تذکرہ گلشن بے غار۔ ایک دیوان اردو اور ایک فارسی انھوں نے یادگار چھوڑا۔ لیکن ان کی تینوں تصنیفیں نایاب ہیں۔ اردو دیوان ۱۸۶۲ء میں مطبع رضوی دہلی میں طبع ہوا۔ رائج نے اس مندرجہ سے تاریخ نکالی۔ ۶

ہے لاجواب و دلکش دیوان شیفتہ کا

مولوی محمد اسماعیل جدید اردو شعر کے معماروں میں سے ہیں۔ انھوں نے زیادہ تر نظمیں کہیں جو زبان، بیان اور موضوع کے لحاظ سے اپنے اندر بہت کچھ نیا پن رکھتی ہیں۔ ان کا کلیات جو تمام اصناف سخن پر مشتمل ہے شایع ہو چکا ہے۔ نومبر ۱۸۶۲ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۶ سال کی عمر میں سرکاری ملازمت کی اور اپنی ذہانت اور غیر معمولی قابلیت سے ترقی کر کے فارسی کی اعلیٰ مدرسے کے عہدے پر فائز ہوئے بارہ سال تک داخل اسکول آگرسے میں رہے۔ ۱۸۹۹ء میں خدمت سے سبکدوش ہوئے اور ۱۹۱۴ء میں انتقال کیا۔

مولانا حسرت موہانی نے اسماعیل میرٹھی کو غالب کے تلامیذ میں شمار کیا ہے۔ حالی اور اسماعیل جدید اردو شاعری کے فروغ دینے والے ہیں۔ اگر اسماعیل کو غالب سے تلمذ حاصل تھا تو جدید اردو شاعری کی تعمیر میں غالب کے فیض تربیت کا بہت بڑا حصہ ہوگا حکیم نصیح الدین قوم کے بنی اسرائیل تھے۔ عربی و فارسی کی تحصیل کے بعد طب کی تکمیل کی اور اسی کو پیشہ بنالیا۔ شعر و سخن کا ذوق بچپن سے تھا۔ مرزا غالب کے شاگرد ہوئے۔ بہارستان ناز کے نام سے سخن گو خواتین کا ایک تذکرہ لکھا جو ۱۸۶۲ء میں میرٹھ سے شایع ہوا۔ یہ شاعرات کا قدیم ترین تذکرہ ہے۔ مولوی عبدالحی صفا بدایونی کا حکیم سخن جس کا دوسرا حصہ شاعرات کے لئے مخصوص ہے ۱۸۶۲ء میں شایع ہوا اور درگا پرشاد نادر دہلوی کا گلشن ناز ۱۸۶۲ء میں۔ آغا حسن عون مرزا صاحب نے توقیعات کسریٰ کو اردو جامہ پہنایا۔ رائج نے حسب ذیل قطعہ تاریخ لکھا :-

مسرت نے مرادہ سنایا مجھے کہ احکام نوشیروانی چھپا
ہوا سن کے مسرور اور شاد ماں دل غنچہ ساں گل صفت ہو گیا
لکھوں اس کے چھپنے کی تاریخ میں اسی فکر میں تھا میں بیٹھا ہوا
یہ نغمہ ہے لوشادمانی نا یکایک سناپ سے ہاتھ کے یوں

نواب کلب علی خاں کے جشن تحت نشینی کے موقع پر غالب کے شاگردوں میں سے صفیر بلگرامی اور مولانا حالی کے ساتھ ساتھ رائج میرٹھی نے بھی ایک تہنیتی قصیدہ لکھا تھا۔ جو غالب کو بھیج دیا گیا تھا۔ غالب نے یہ قصیدہ میرٹھی سرکار رامپور میں روانہ کر دیا۔ رائج کے قصیدہ کا مطلع ہے :-

آج کل چلتی ہے عالم میں خوشی کی وہ ہوا آشیاں بن ناچتا ہے طائر قبلہ نا

۱۷ اردو صفحہ ۷ - ۸ - ۹ شہر دیوان غالب، حسرت موہانی صفحہ ۷ طبع پنجم

ن کی غزلیات کا مجموعہ شائع ہوا تھا لیکن آج نایاب ہے۔ نسخہ نے سخن شعرا میں ان کے صرف تین شعر نقل کئے ہیں :-

نامہ مجھ سے وہ غیر کو لکھوائیں ✓ یہ بھی لکھا حرمے مقدر کا ✓
اک بار اور میری عیادت کو آئیے ✓ اچھی طرح سے میں ابھی اچھا نہیں ہوا ✓
میں خوب جانتا ہوں اکاؤٹ کو آپ کی ✓ آنکھیں تول رہی ہیں مگر دل ملا نہیں ✓

(۶)

غالب کم سے کم تین مرتبہ میرٹھ گئے اور تینوں مرتبہ اپنے عزیز دوست اور شاگرد نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے یہاں فرشتے ہوئے۔ پہلی بار وہ نواب صاحب سے ملنے گئے اور تین روز قیام کیا۔ یہ ۱۸۵۹ء کا واقعہ ہے۔ شیفتہ کے ہنگامے کے بعد نواب صاحب بھی دوسرے روز دار اور باعزت مسلمانوں کی طرح بغاوت کے جرم میں مانوڑ ہوئے تھے۔ یہ دور ان کے لئے سختی اور ابتلا کا دور تھا۔ جاگیر، املاک، اور مال و متاع سب کچھ ضبط کر کے حکومت نے سات سال کے لئے انھیں وقت زنداں و سلاسل کر دیا گیا۔ نواب صاحب رہائی پا کر میرٹھ چلے گئے۔ غالب ان سے ملنے گئے۔ یہ تمام تفصیلات ذیل کے خط میں جو میرٹھ دی کے نام ہے وہ غالب نے لکھی ہیں :-

”خواب مصطفیٰ خاں بیعہ سات برس کے قید ہو گئے تھے۔ سوان کی تقصیر معاف ہوئی۔ اور ان کو رہائی ملی صرف رہائی کا حکم آیا ہے۔ جہانگیر آباد کی زمینداری اور دلی کی املاک اور پنشن کے باب میں ہنوز کچھ حکم نہیں ہوا ہے۔ ناچار وہ رہا ہو کر میرٹھ ہی میں ایک دوست کے مکان میں ٹھہرے ہیں۔ میں مجھ داس خبر کے استماع کے ڈاک میں اپنے گھر آیا۔ دن اور تاریخ آنے جانے کی یاد نہیں۔ مگر ہفتہ کو گیا۔ منگل کو آیا۔ آج بدھ دوم فروری ہے۔ مجھ کو آئے ہوئے نوادن ہے۔“

غالب ہفتہ کو دہلی سے میرٹھ گئے اور منگل کو واپس آئے۔ تفتہ کے نام ایک خط اردو سے معلیٰ میں ہے جو چار شنبہ ۲۶ جنوری ۱۸۵۹ء کو لکھا گیا۔ اس میں غالب فرماتے ہیں :-

”مصطفیٰ خاں کی ملاقات کو بسبیل ڈاک میرٹھ گیا تھا۔ تین دن وہاں رہا۔ کل وہاں سے آیا۔ آج تم کو یہ خط بھیجوا۔“

اس سے معلوم ہوا کہ منگل کی ۲۵ تاریخ تھی۔ غالب ہفتہ کو میرٹھ روانہ ہوئے تھے اور ہفتہ کو جنوری کی ۲۲ تھی۔ اس لئے آنے جانے کی تاریخ بھی متعین ہو گئی۔ ہفتہ ۲۲ جنوری ۱۸۵۹ء کو غالب دہلی سے میرٹھ پہنچے اور ۲۵ جنوری منگل کو پورے تین روز قیام کرنے کے بعد واپس چلے آئے۔ ”عود“ کے خط میں جو میرٹھ دی کے نام ہے غالب نے آنے اور جانے کی تاریخوں کو محسوب کرنے کے بعد لکھا ہے کہ وہ چار روز میرٹھ میں رہے۔ ویسے وہ صرف تین روز رہے تھے جیسا کہ اوپر دئے خط میں ہے۔ تفتہ کے نام ایک خط اور بھی ہے جو اس خط کے چار روز بعد ۳۰ جنوری ۱۸۵۹ء کو لکھا گیا۔ اس میں بھی غالب نے میرٹھ سے واپسی اور تحریر خط کے دن کا تفصیل ذکر کیا ہے۔

”نواب مصطفیٰ خاں کے ملنے کو بسبیل ڈاک میرٹھ گیا تھا اور شنبہ کے دن دلی آ گیا اور چار شنبہ کے دن تم کو خط بھیجوا۔“ دوسری مرتبہ رام پور جاتے ہوئے وہ میرٹھ ایک روز کے لئے ٹھہرے۔ اس کا ذکر مرزا نے اپنے کئی رقعات میں کیا ہے اور تاریخ درود کی تعیین کے ساتھ کیا ہے۔ تفتہ کو لکھتے ہیں :-

”بھائی میں نے دلی کو چھوڑا اور رام پور کو چلا۔ پنج شنبہ ۱۹ کو مرادنگر اور جمعہ ۲۰ کو میرٹھ پہنچا۔ آج شنبہ ۲۱ کو بھائی مصطفیٰ کے

کہنے سے مقام کیا۔ یہاں سے یہ خط تم کو لکھ کر بھیجا۔“

یہ خط ۲۱ جنوری ۱۸۵۹ء کو میرٹھ سے لکھا گیا۔ اس کے ساتھ ہی حکیم غلام نجف خاں کو بھی غالب نے ایک خط لکھا تھا۔ اس میں بھی

میرٹھ میں درود کی تاریخ غالب نے ۲۰ جنوری بتائی ہے۔

دوسرے دن یعنی جمعہ کو میرٹھ پہونچا نواب مصطفیٰ خاں نے ایک دن رکھ لیا۔ آج شنبہ ۲۱ جنوری یہاں مقام ہے۔

مرادنگر، میرٹھ، شاہ جہاں پور، گڑھ مکیشتر، مراد آباد ہوتے ہوئے غالب رام پور پہونچے واپسی کی منزلوں کا ٹھیک ٹھیک علم نہیں لیکن غالب خیال یہی ہے کہ وہ اسی طرح پڑاؤ کرتے اور منزلوں پر منزلیں کرتے ہوئے دہلی واپس ہوئے۔ واپسی میں ایک روز میرٹھ میں قیام کیا اور اس مرتبہ نواب صاحب کی قیامگاہ پر نشی ممتاز علی صاحب سے ان کی ملاقات ہوئی۔ اس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ غالب شیونرائین کو لکھتے ہیں:-

”جب میں رام پور سے میرٹھ آیا۔ بھائی مصطفیٰ خاں صاحب کے ہاں اترا۔ وہاں نشی ممتاز علی صاحب میرے قدیم دوست تھے۔“

غالب ۷ مارچ کو رامپور سے دہلی روانہ ہوئے اور ۲۴ مارچ کو دہلی پہونچے۔ از روئے حساب منازل ۲۲ مارچ کو انھوں نے میرٹھ میں قیام کیا۔ اور چونکہ ماہ صیام قریب تھا اور غالب ۳۰ شعبان (۲۴ مارچ) تک دہلی پہونچ جانا چاہتے تھے اس لئے وہ زیادہ قیام نہ کر سکے۔ غالب نے رامپور جانے کے لئے یہ پھیر کا راستہ اس لئے اختیار کیا تھا کہ وہ نواب صاحب سے مل سکیں۔ رام پور کا دوسرا سفر انھوں نے براہ پلکھوہ اور غازی آباد طے کیا۔

جنوری ۱۸۵۹ء سے مارچ ۱۸۵۹ء تک غالب نے میرٹھ کے تین سفر کئے۔ صرف چھ روز وہاں مقیم رہے اور دو خط انھوں نے وہاں سے اپنے احباب کو لکھے۔ ۱۸۵۹ء کے ہنگامے سے پہلے بھی انھوں نے میرٹھ کا کوئی سفر کیا تھا یہ وثوق کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا۔

(۷)

میرٹھ کے فرزندان کی غالب سے عقیدت ایسی نہ تھی جو بیانی اور بصیرت کو سلب کر لیتی ہے۔ ان کی غالب کے ساتھ بڑھی ہوئی محبت نے ان کو ابھانہ بنایا بلکہ غالب کے معائب و محاسن کو پرکھنے کے بعد کمال کی قدر کرنے اور غلطی کو پکڑنے کا موقع بھی دیا۔ غالب ایک عظیم شخصیت کے مانگ تھے۔ خدا کی طرف سے انھیں بے پایاں صلاحیتیں عطا ہوئی تھیں۔ ۱۸۵۹ء کی گروہ دار کے زمانہ میں وہ خانہ نشین رہے۔ کتب بینی کے سوا اور کوئی مشغلہ نہ تھا۔ خصوصیت کے ساتھ مشہور فارسی لغت ”برہان قاطع“ ان کے مطالعے میں تھی۔ مطالعے کے دوران میں جو فروگزاشتیں اس لغت میں نظر آئیں انھیں حاشیہ پر نوٹ کرتے رہے۔ بعد میں ان نوٹوں کی مدد سے ”قاطع القاطع“ کے نام سے ایک رسالہ شایع کیا جس میں ”برہان کی عبارت کی سستی اور بیان کی غلطی“ دکھائی گئی تھی۔ اس رسالے کے شایع ہوتے ہی علمی دنیا میں گھل بلی مچ گئی اور غالب کے خلاف ایک ہنگامہ رستاخیز ہوا ہو گیا۔ اس کے جواب میں جو کتابیں اور رسالے تصنیف ہوئے ان میں مرزا رحیم بیگ میرٹھی کی ”ساطع برہان“ بھی ہے جو ”موید“ کے بعد مرزا کی کتاب قاطع کا سب سے زیادہ معقول اور برل جواب ہے۔

مرزا رحیم بیگ کے والد کا نام پیر بیگ تھا۔ سرحد ضلع میرٹھ کے رہنے والے تھے۔ تعلیم و تربیت میرٹھ میں ہوئی اور میرٹھ ہی میں درس و تدریس میں لگ گئے۔ اسماعیل میرٹھی کے برادر اکبر مولوی عبدالحکیم چوہدری نے فارسی کی درسی کتابیں انھیں سے بڑھیں۔ کثرت مطالعے سے آخر میں بصارت جاتی رہی تھی لیکن بصیرت آگئی تھی۔ رحیم نے ساطع میں لکھا ہے۔ ”حقیق تحقیق لغات و کنایات از خجائذ فیض صہبائی خورد“ اس سے غالب اور دوسرے اہل علم کو شبہ ہوا کہ وہ صہبائی سے تلمذ کے دعویدار تھے۔ گلستان سخن میں ہے کہ صہبائی نے تحصیل کتب درسی اور مشورہ سخن کا اتفاق نہیں ہوا۔ لیکن اپنے بعض رسائل انھوں نے اصلاح کی غرض سے صہبائی کو دکھائے اور مراسلت و مکاتبت سے استفادہ کیا۔

نساخ نے رحیم کو مولوی محمد بخش نادان بریلوی کا شاگرد بتایا ہے اور لکھا ہے کہ فارسی اور ریختہ دونوں میں شعر کہتے ہیں۔ پہلے شعر تخلص کرتے تھے۔ بعد میں رحیم اختیار کر لیا۔ شعراء کا ایک تذکرہ مخزن الشعراء کے نام سے لکھا تھا جو میری نظر سے گزرا ہے۔ ذیل کے دو شعر نساخ کے انتخاب میں آئے۔

دوں میں کس کس کو کہ اس جانی کے خواہاں ہیں بہت غم جدا، فکر جدا، درد جدا، یار جدا،
طفیل لاغری میں رہ گیا ہوں کوئے جاناں میں، کہ مثل بونظر آتا نہیں اور ہوں گلستاں میں

ساطع برہان ۱۲۸۵ھ (مطابق ۱۸۶۵ء) میں ہاشمی پریس میرٹھ سے شایع ہوئی ۱۸۴ صفحات میں غالب کے قریب قریب تمام اعتراضات کے جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ لہجہ عموماً طنزیہ ہے۔ کہیں کہیں طنز میں تلخی، تیزی اور زہرناکی بھی شامل ہو گئی ہے مثلاً اس قسم کی جوڑیں بہت ہیں کہ غالب سے بحث و مقابلہ قضیع اوقات ہے۔

غالب نے ساطع کے جواب میں رحیم کو ایک خط لکھا تھا جو نامہ غالب کے عنوان سے اول اول دہلی میں چھپا۔ اس کے بعد اودھ اخبار لکھنؤ کی ۱۰ و ۱۱ اکتوبر ۱۸۶۵ء اشاعتوں میں۔ آخر میں منشی ممتاز علی صاحب نے اس کو عود ہندی میں شامل کر لیا۔ غالب سیاح کو ایک خط میں لکھتے ہیں:-

”وہ جو ایک اردو کتاب کا تم نے ذکر لکھا ہے وہ ایک لڑکے پڑھانے والے ملائے مکتب دار کا خط ہے۔ رحیم بیگ اس کا نام۔ میرٹھ کا رہنے والا۔ کئی برس سے اندھا ہو گیا ہے۔ باوجود نابینائی کے احمق بھی ہے۔ اس کی تحریر میں نے دیکھی۔ تم کو بھی بھیجوں گا مگر ایک بڑے مزے کی بات ہے کہ اس میں بیشتر وہ باتیں ہیں جن کو لطیف غیبی میں رد کر چکے ہو۔ بہر حال اب اس کے جواب کی فکر نہ کرنا“

یہ خط ساطع برہان کی اشاعت کے بعد ۱۱ ستمبر ۱۸۶۵ء کو لکھا گیا۔ اس کے چھ روز بعد سیاح کو غالب نے دوسرا خط لکھا۔ اس میں رحیم کے متعلق کچھ زیادہ تفصیل ہے:-

”رحیم بیگ کا وطن اصلی سر دھنہ، فی الحال میرٹھ میں مقیم اور معلم اس کا پیشہ ہے اور آٹھ دس برس سے اندھا، نظم و نثر میں مولوی امام بخش صہبائی کا شاگرد اور فارسی شعر کہتا ہے۔“

نامہ غالب کی اشاعت کے بعد اس رسالے کا تعارف کرتے ہوئے غالب نے مولوی عبدالرزاق شاکر کو لکھا:-

”نامہ غالب کا مکتوب الیم رحیم بیگ نامی میرٹھ کا رہنے والا ہے۔ دس برس سے اندھا ہو گیا ہے۔ کتاب پڑھ نہیں سکتا اس لیے ہے۔ عبارت لکھ نہیں سکتا لکھوا دیتا ہے۔ اہل دہلی کہتے ہیں کہ مولوی امام بخش صہبائی سے اس کو تلمذ نہیں ہے۔ اپنا اعتبار پڑھانے کو اپنے کو ان کا شاگرد بتاتا ہے۔ میں کہتا ہوں واسے اس بیچ پوچھ پر جس کو صہبائی کا تلمذ موجب عرو و قار ہو۔ رسالہ اس کا ساطع برہان دلی پہونچے کر ڈھونڈوں گا۔ اگر مل گیا تو خدمت میں پہونچے گا۔“

یہ رقعہ رام پور سے لکھا گیا ہے۔ مرزا ۱۲ اکتوبر ۱۸۶۵ء سے ۲۸ دسمبر ۱۸۶۵ء تک وہاں مقیم رہے تھے اس لئے یہ خط اکتوبر اور دسمبر کے درمیان کسی تاریخ میں لکھا گیا۔ تیغ تیز کے دیباچے میں بھی غالب نے رحیم کا ذکر کیا ہے۔

”پھر ایک مرزا رحیم بیگ میرٹھ کے رہنے والے:- روئے کار آئے۔ اور ایک تحریر مسمیٰ:- ساطع برہان نکال ڈالے۔ مطالب مندرجہ لغو۔ بیشتر محرق قاطع کے مضامین منقول۔ فقیر نے صرف ایک خط مرزا جی کو لکھا۔ زیادہ اس طرف التفات کو قضیع اوقات جانا“

نامہ غالب ساطع برہان کا جواب نہیں۔ اس میں چند جزوی بحثوں کو چھیڑا گیا ہے اور وہ بھی بڑی حد تک تشنہ رہ گئی ہیں۔ اسکی وجہ شاید یہ معلوم ہوتی ہے کہ غالب کے خیال میں مرزا رحیم بیگ نے ساطع میں محرق کے مضامین لفظی تصرف کے بعد نقل کر دئے تھے جن کو سیاح لطایف میں پہلے ہی تفصیل کے ساتھ رو کر چکے تھے۔

(۸)

پانچ برس کی عمر سے غالب کو ان کے چچا مرزا نصر اللہ بیگ نے پرورش کیا۔ ۱۸۰۶ء میں وہ انتقال کر گئے۔ اس وقت غالب کے ۱۰ انا خواجہ غلام حسین آگرے کے رؤساء میں سے تھے۔ چچا کے انتقال کے بعد مرزا کی سرپرستی ان کے ملتانے کی۔ خواجہ غلام حسین مولانا حالی کی روایت کے مطابق میرٹھ کی سرکار میں فوج کے کمیدان (نائب کپتان) تھے۔ ٹھیک ٹھیک نہیں بتا سکتا کہ وہ کب تک میرٹھ میں رہے اور کب اس خدمت سے سبکدوش ہوئے۔ لیکن ۱۸۱۶ء کے بعد بھی اگر وہ میرٹھ میں تھے تو غالب نے طفلی کے ایام میرٹھ میں گزارے۔ خود غالب کی تحریروں سے اس پر کوئی روشنی نہیں پڑتی۔ چونکہ یہ ان کے شعور سے پہلے کی بات ہے اس لئے ممکن ہے اس زاد کی کوئی یاد ان کے ذہن میں محفوظ نہ رہی ہو ذیل کے خط میں جو منشی شیونرائی کے نام ہے انھوں نے صرف اس قدر لکھا ہے :-

”جب میرے نانا نے نوکری ترک کی اور گھر بیٹھے تو تمھارے دادا نے بھی کمر کھول دی۔ اور پھر کہیں نوکری نہ کی۔ یہ باتیں میرے ہوش سے پہلے کی ہیں“

غالب کا حلقہ احباب بہت وسیع تھا۔ میرٹھ کے احباب میں سے نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ اور منشی ممتاز علی کا ذکر غالب کے خطوط اور ان کی دوسری تحریروں میں ملتا ہے۔ ان کے علاوہ میں میرٹھ کے کسی شخص کو نہیں جانتا۔ غالب سے وہ کمر رسم آشنائی رکھتا ہو۔ میرا خیال ہے کہ منشی غلام بسم اللہ ان کے خاص احباب میں سے تھے۔ ان کے نام کا ایک خط عود کے آخر میں ہے۔ یہ میرٹھ کی عدالت منصفی میں ناظر تھے۔ خود بھی شعر کہتے تھے اور ان کے منصف بھی اور غالب کو دکھاتے تھے۔ کوئی غزل اصلاح کے لئے بھیجی۔ غالب نے اس میں بہت کم قلم لگایا۔ منشی صاحب نے شکایت کی کہ آپ توجہ کے ساتھ اصلاح نہیں فرماتے۔ یہ نہ تو سرسری دیکھ کر لٹا دیتے ہیں غالب نے جواب دیا :-

”صاحب یہ نیا ڈھنگ ہے شکایت کا۔ اگر تمھارے کلام میں اصلاح کم ہو تو وہ کلام کی خوبی ہے۔ اس کو استاد کی سیل نکاری کیوں سمجھو؟ آپ کے منصف صاحب کی بھی غزل میں اصلاح کم ہوئی ہے۔ پس ان کو چاہئے کہ خوش ہوں کہ مجھ سے گلہ کریں۔“

حکیم غلام مولیٰ صاحب قلاق، مومن خاں کے شاگرد تھے لیکن غالب کی خدمت میں بھی نیاز حاصل تھا اور ان سے نیاز مندانہ عقیدت رکھتے تھے۔ ”عود ہندی“ کے آخر میں جو ان کی تقریباً شامل ہے، اس کے لفظ لفظ سے غالب کے ساتھ ان کی ادات اور قلبی تعلق کا اظہار ہوتا ہے۔

ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی نے غالب کے جو چند خطوط رسالہ ہندوستانی ۱۹۳۷ء میں شائع کرائے ہیں ان میں ایک خط حکیم محب علی نیر کے نام ہے۔ یہ میرٹھ میں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے پڑوس میں رہتے تھے اور شاید ان سے تلمذ بھی تھا۔ ان کے صاحبزادے منشی مشکور علی کا بیان ہے کہ ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے دوران میں ان کے والد مرحوم میرٹھ کی عدالت کے سرورشتہ نظارت میں اپنے والد کی جگہ پر کار گزار تھے۔ ہنگامہ فرو ہونے کے بعد میرٹھ سے ہجرت کر کے مین پوری چلے آئے اور وکالت کرنے لگے۔ طبابت بھی کرتے تھے مگر یہ ذریعہ معاش نہ تھا۔ اگست ۱۹۰۴ء میں انتقال کیا۔ غالب نے اپنے خط میں لکھا ہے :-

”بندہ پرور! آپ کی تحریر سے متنبہ ہوتا ہے کہ آپ مجھ سے میرٹھ میں ملے تھے۔ مگر میرا ہر چند یاد کرتا ہوں مجھ کو وہ صحت اور

آپ کی ملاقات کی صورت یاد نہیں آتی۔

اس خط کی تاریخ ٹھیک معلوم نہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا قیاس ہے کہ ۱۳۶۳ء کے بعد لیکن ۱۳۶۵ء سے پہلے لکھا گیا۔ اگر صحیح ہے کہ محب علی صاحب ۱۳۵۷ء کے بعد ملازمت چھوڑ کر مین پوری چلے گئے تھے تو غالب کی ان سے ملاقات ۱۳۵۷ء سے پہلے ہوئی۔ اور اس سے ثابت ہوا کہ ہنگامے سے پہلے بھی مرزا کا میر تقی آنا جانا تھا۔ اور کسی ایسے ہی موقع پر محب علی صاحب نے اپنی غزلوں کے مسودے انھیں دکھائے تھے۔ لیکن بظاہر یہ صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ یہ پہلا خط ہے جو غالب نے حکیم صاحب کو ان کے خط کے جواب میں لکھا۔ اگر حکیم صاحب ۱۳۵۷ء سے پہلے غالب سے ملاقات کر چکے تھے تو اتنے عرصہ تک باہم اجنبیت کیوں رہی اور پورے چھ سال کے بعد حکیم صاحب نے مکاتبت کا سلسلہ کیسے شروع کیا۔ میرا خیال ہے کہ حکیم صاحب ۱۳۵۹ء میں غالب سے نواب صاحب کے مکان پر ملے جب وہ نواب صاحب کو دیکھنے میر تقی گئے تھے۔ اس کے بعد میر تقی سے وہ مین پوری چلے آئے۔ نئی جگہ کی فنی ذمہ داریوں نے انھیں سر اٹھانے کی جہالت نہ دی۔ اس لئے وہ غالب کو ۱۳۶۳ء سے پہلے کوئی خط نہ لکھ سکے۔

بہر حال جو صورت بھی ہو حکیم محب علی صاحب کو غالب کے ان احباب اور تلامذہ میں شمار کرنا چاہئے۔ جن کا تعلق سرزمین میر تقی سے تھا۔

شوکت سبزواری

سالنامہ ”نگار“ ۱۳۵۷ء ”علماء اسلام نمبر کا ایک اقتباس“

اسی طرح کے سیکڑوں علماء اسلام کا ذکر آپ کو سالنامہ ۱۳۵۷ء میں ملے گا

ابوالعلاء (المعری) احمد بن عبد اللہ بن سلیمان - پیدائش (معرۃ النعمان) ۱۱۶۳ھ - انتقال ۱۲۴۹ھ
اپنے عہد کا بڑا مشہور شاعر و نقاد تھا۔ چار سال کی عمر میں حج کی نکل آنے سے اندھا ہو گیا۔ لیکن حافظہ اس بلا کا تھا کہ جو ایک بار سن لیتا تھا اسے بھولتا
۱۱۷۹ھ - ابتدائی تعلیم صلب، طرابلس اور انطاکیہ میں حاصل کی۔ گواس کی تعلیم بھی متنبی کی طرح ایک قصیدہ گو شاعر کی حیثیت سے ہوئی، لیکن اس کی غیور طبیعت
نے مدح گوئی کا پیشہ پسند نہ کیا اور اپنے وطن معر میں گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کر لی۔ ۱۱۸۱ھ کے بعد بغداد گیا، لیکن دیرہ سال کے بعد اپنی ماں
کی علالت کی وجہ سے پھر وطن واپس آ گیا۔ اس کی شاعری متنبی کے رنگ کی تھی اور اس حیثیت سے اس نے ملک میں بڑی شہرت حاصل کی۔ گواس نے
ترک دنیا کر کے پہاڑ کے ایک غار میں رہنا شروع کر دیا تھا، لیکن دور دور سے طلبہ اس کے پاس آتے اور تعلیم حاصل کرتے۔ ناصر خسرو مشہور ایرانی بہار
بھی ۱۲۳۹ھ میں اس سے ملنے معر گیا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ ”ابوالعلاء کا یہاں بڑا اثر ہے اور وہ بڑی دولت کا مالک ہے، لیکن وہ خود راہبانہ زندگی بسر
کرتا ہے اور اپنی دولت غریب کو تقسیم کر دیتا ہے۔“ اس نے گوشت انڈا اور دودھ کھانا بھی ترک کر دیا تھا اور نہایت سخت راہبانہ زندگی بسر کرتا تھا۔
اس نے ۱۲ سال تک راہبانہ زندگی گزاری، لیکن بیکاری کی نہیں، کیونکہ اس نے اسی زمانہ میں متعدد کتابیں لکھیں۔ مشرق میں اس کی شہرت کا سبب اس کی ابتدائی
نظموں کا مجموعہ سقط الزند ہے جس کی متعدد شرحیں لکھی گئیں، جن میں سب سے بہتر شرح ”ضوء السقط“ خود اسی کی لکھی ہوئی ہے، اس مجموعہ میں بعض نظمیں ایسی
ہیں جن سے اس کی مذہبی آزادی پر روشنی پڑتی ہے، لیکن یہ آزاد ہی اس کے دوسرے مجموعہ کلام ”لزوم الایلموم“ یا ”لزومیات“ میں زیادہ نمایاں ہے۔ وہ
اس مجموعہ میں ایک مفکر اور بلند اخلاقی شاعر کی حیثیت سے سامنے آتا ہے اور اسلاف کی روایتی تقلید سے ہٹ کر مذہب و انسانیت کے مسئلہ پر غور کرتا ہے۔ اس کی
تیسری تصنیف رسالہ ”الغفران“ نشر میں ہے۔ اس میں دکھایا ہے کہ ملحد شعراء کس طرح بہشت میں پہنچتے ہیں اس کتاب کا انداز Divine Comedy کا
سا ہے جس میں مروج عقاید شر و فتنہ کو بیان کیا گیا ہے۔ اس میں آزاد خیال و نادقہ کے خیالات بھی اس نے پیش کئے ہیں۔ ابوالعلاء کو عام طور پر ملحد خیال کیا جاتا ہے چنانچہ
کہا جاتا ہے کہ اس نے ایک کتاب ”الفصول والغايات“ قرآن کے جواب میں بھی لکھی تھی، لیکن ابوالعلاء نے خود اس کی تردید کی ہے۔ وہ موجد ضرورت تھا لیکن خدا کا تصور
اس کے یہاں عام مروج تصور سے علیحدہ تھا، وہ وحی و الہام کا بھی قائل نہ تھا۔ وہ مذہب کو خود انسانی ذہن و دماغ کی تخلیق سمجھتا تھا۔ وہ مشر و نشر کا اور
بقا و روح کا بھی قائل نہ تھا۔ وہ نماز روزہ سے زیادہ بلندی اخلاق کا قائل تھا۔

نئی شاعری میں کلاسیکی عناصر

میں نے اپنے مضمون کے لئے یہ عنوان تو قیام کر لیا ہے لیکن مجھے امید نہیں کہ میں اس موضوع کا حق بھی ادا کر سکوں گا۔ اس لئے کہ ابھی چند دنوں پہلے یہ بات میرے ذہن میں آئی ہے اور میرے سارے خیالات ادھر کپڑے سے ہیں۔ میں اس وقت جو کچھ کہوں گا وہ محض حرف آغاز کے طور پر ہوگا۔ ابھی تو اس نقطہ نظر سے مجھے جدید شاعری کو پھر ایک بار پڑھنا ہے اور پورے سرمائے کو چھان بھینک کر اس کا تجزیہ کرنا ہے۔

مجھے یاد آتا ہے کہ آج سے دس گیارہ سال پہلے جب میں نے ہوش سنبھالا تو مجھے دو چیزوں نے بہت متاثر کیا۔ ایک ہندوستان کی تحریک آزادی نے دوسرے نیا ادب اور نئی شاعری نے۔ تیرہ، چودہ سال کی عمر نیا خون اور نیا حوصلہ۔ جوش، احسان و دانش، روش صدیقی اور ساغر نظامی کی وہ ساری نظمیں مجھے زبانی یاد تھیں جن میں غیر ملکی سامراج کے غلات آواز اٹھائی گئی تھی اور آزادی، انقلاب، مزدور اور کسان کا ذکر ہوتا تھا۔ اس وقت مجھے کوئی ایسا شخص ملتا جو برطانوی حکومت کا حامی یا تحریک آزادی کا مخالف ہوتا تو میں اسے برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ آہستہ آہستہ میں نے نئے شاعروں کا کلام پڑھنا شروع کیا۔ مجاز، جذبی، مخدوم محی الدین، شمیم کرمانی، علی جواد زیدی، سلام مچھلی شہری، اختر انصاری، مسعود اختر جمال، شہاب علی آبادی، وقار انبالوی، ڈاکٹر تاشرف فیض احمد فیض، ن۔ م۔ راشد، میراجی، محمود جالندھری، اختر الایمان، یوسف ظفر، قیوم نظر، ضیا جالندھری، مختار صدیقی، ساحر لدھیانوی، احمد ندیم قاسمی، کیفی اعظمی، عبد الحمید بھٹی، ڈاکٹر تضرع حسین خالد، دامق جونپوری، جاں نثار اختر اور علی سردار جعفری وغیرہ کی بہت سی نظمیں میری نظر سے گزریں۔ بعض لوگوں کے مجموعے شایع ہو چکے تھے۔ لیکن زیادہ تر نظمیں نیا ادب، ہندوستان (ہفتہ وار)، ادبی دنیا، ہمایوں، ادب لطیف اور ساتی وغیرہ میں پڑھی تھیں۔ اس وقت ایک میں کیا، میرے جیسے سارے نوجوان اور وہ لوگ بھی جو مجھ سے عمر میں بڑے تھے، نئی شاعری پر بری طرح جان دیتے تھے، اس کے غلات ایک لفظ بھی سنتا برداشت نہیں کرتے تھے۔ نئی شاعری پر پرانے لوگوں کی طرف سے کافی اعتراضات ہورہے تھے۔ اس کو پروگنڈا بتایا جاتا، نئے شاعروں کو فن سے بے بہرہ بتایا جاتا، آزاد شاعری کو لنگڑی شاعری اور ہڈیاں کھکھریکا جاتا "مداوا" شایع ہو چکی تھی۔ جس میں نئے شاعروں کی خوب گٹھلی اچھالی گئی تھی۔ اس وقت میرے دوست اور ساتھی اور میری عمر کے نوجوان ان تمام اعتراضات کو بکواس کہہ کر ٹال دیتے اور کہتے کہ دنیا نویں لوگ تو ایسی باتیں کہتے ہی ہیں۔ لیکن کبھی کبھی میں ایک عجیب سوچ میں پڑ جاتا۔ پرانے لوگوں میں بعض لوگ تو واقعی حکومت برطانیہ کے ازلی و فاداروں میں تھے۔ اس لئے ان کو نئی شاعری اس لئے ناپسند آتی تھی کہ اس میں سیاست کی بات کہی جاتی ہے۔ لیکن میں دیکھتا تھا کہ بعض معقول لوگ بھی جو خیالات کے لحاظ سے بڑے ترقی پسند تھے نئی شاعری سے کچھ بدکتے تھے۔ ایک بات اور بڑی دلچسپ تھی کہ ان میں سے بعض شاعروں کو پرانے نقطہ نظر کے لوگ بھی پسند کرتے تھے۔ جوش، اور ساغر کو چھوڑئے۔ جذبی، مجاز، اختر انصاری، فیض، مخدوم محی الدین وغیرہ کی بہت سی چیزوں کو پرانے انداز کے لوگوں نے بھی پسند کیا تھا۔ جذبی کے ایک شعر کو حضرت اشرف لکھنوی نے پوری کرتی پسند شاعری کے ہم پلہ قرار دیا تھا۔ مجاز کے متعلق کسی نے کہا تھا کہ ہماری شاعری نے بھی ایک گیتس پیدا کیا تھا لیکن اسے ترقی پسند بھیڑئے اٹھائے گئے۔ اختر انصاری کی شاعری کو بھی عندلیب شادانی، نیاز فتحپوری اور بعض دوسرے بزرگوں نے بہت پسند کیا تھا ان شعراء کو کبھی جزوی طور پر لوگ پسند کرتے تھے۔ لیکن ان کی عام روش کو دیکھ کر اور پھر ان شعراء کو دیکھ کر جو ان کی سمجھ سے بالاتر تھے لوگوں کی ہوا رائے تھی کہ نئی شاعری ہمارے ادب کو مہیا میٹ کر رہی ہے۔ جوش، ن۔ م۔ راشد، میراجی اور بعض دوسرے شعراء سے لوگ اس لئے بھی

خفا ہوتے تھے کہ یہ لوگ مذہب اور اخلاق پر حملہ کرتے اور پرانی اقدار پر ضرب لگاتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ پرانے لوگوں میں سب ہی نئے تجربات کے خلاف تھے، لیکن مصیبت یہ تھی کہ نئی تکنیک میں جو نظمیں لکھی جا رہی تھیں ان میں یا تو ”خدا“ پر حملہ ہوتا (جیسے راشد کے یہاں) یا پھر عریانی اور جنس کی فراوانی ہوتی (جیسے میراجی اور محمود جالندھری کے یہاں) اور زیادہ تر تو ایسا ہوتا کہ ان نظموں میں اتنا ابہام ہوتا کہ انہیں سمجھنا مشکل تھا (میراجی، تصدق حسین خالد، عبدالمجید بھٹی اور پنجاب کے دوسرے شعرا میں خاص طور پر) کبھی کبھی خاص طور پر کبھی کبھی آزادوں کی کوئی ایسی نظم ہوتی جس میں وضاحت ہوتی، ترکیبوں کی، نفاست کا بھی خیال رکھا جاتا اور موضوع بھی قابل اعتراض نہ ہوتا۔ تو لوگ اسے پسند کر لیتے تھے۔ حسرت موہانی کے بارے میں مجھے معلوم ہوا ہے کہ انھوں نے بعض اچھی آزاد نظموں کی تعریف کی تھی۔ خود میرے سامنے کی بات ہے کہ انظم گڑھ میں علی جواد زیدی نے اپنی آزاد نظم ”لاش“ سنائی جو جہاد یو ڈیسیائی کی موت پر لکھی گئی تھی تو اسے مولانا اقبال احمد پٹیل نے کافی پسند کیا جو خود پرانی شاعری کے حامیوں میں سے تھے اور نئی شاعری سے بہت ناراض تھے، انھوں نے کہا تھا کہ اگر ہمارے شعراء ایسی آزاد نظمیں لکھیں تو کوئی ہرج نہیں ہے۔ علی جواد زیدی کی نظم ہولی بھی جو شاعر کے اندرون پر لکھی گئی تھی پرانے لوگوں سے داد حاصل کر چکی تھی۔

نئے اور پرانے ادب کی آویزش کا یہ زمانہ بڑا بحرانی زمانہ تھا۔ میں ایک بات اور محسوس کر رہا تھا کہ پرانے انداز کے لوگ نئے شعراء کی جس بات سے خوش ہوتے ہیں یعنی بعض شعراء کے یہاں قدیم اصولوں کی پاسداری یعنی شراب نہ پینے، عریانی نہ ہونے، عورتوں سے اجتناب نہ ہونے، یہ بات نوجوانوں کو بالکل نہیں بھاتی تھی۔ اور نہ وہ اپنے شعراء کی ان باتوں کو اپنانے کی طرف توجہ دیتے تھے۔ اس وقت بالکل نئے شاعر جو میدان میں آ رہے تھے وہ جوش کی طرف لپکتے یعنی شاعری میں خوب گرج اور جوش و خروش ہو۔ سرمایہ داروں کی ہڈیاں چبا ڈالی جائیں اور اخلاق و مذہب کے قصر کو ڈھا دیا جائے۔ جو نوجوان جوش کے اثر سے بچ رہے وہ راشد اور میراجی کی طرف چلے جاتے۔ خاص طور پر میراجی کی طرف اس لئے کہ راشد کی زبان میں فارسیت اور اس کے یہاں ایک منجھا ہوا انداز تھا جو عام نوجوانوں کی دسترس سے باہر تھا اس لئے میراجی کا طرز مقبول ہونے لگا اور پنجاب کے تو زیادہ تر شعراء اسی طرف دوڑ پڑے۔ خود وہ شعراء بھی جو اس وقت کافی مشہور ہو چکے تھے، ان میں سے بعض کو چھوڑ کر زیادہ تر انھیں گروہوں سے وابستہ تھے۔ مجاز کی شاعری میں جہاں پرانی غزل گوئی اور اختر شیرانی کی نظم نگاری کا اثر تھا وہاں اس کا ایک بڑا حصہ جوش کے اثر سے بھی لکھا گیا تھا۔ جس میں وہی ایجان اور گھن گرج تھی اور یہ شاعری خون، آگ، طوفان، آگ اور انگاروں سے بھری تھی۔ جاں نثار اختر، مخدوم محی الدین، علی سردار جعفری اور تحسین کرہانی، جوش سے بہت متاثر نظر آ رہے تھے۔ ایک نئے اسلوب کی طرف سے بڑھ رہے تھے۔ بعض جگہوں پر اقبال کا اثر تھا اور بعض جگہوں پر بالکل پرانی اور نئی آواز کو ظاہر بالکل منفرد آواز پیدا کر لی گئی تھی جیسے ”اندھیرا“ اور ”اسٹالین کی آواز“ میں۔ سردار جعفری کے جوش سے متاثر تھے کچھ اقبال سے۔ عرصہ تک وہ آزاد نظم کو اردو شاعری پر ایک بدنام دارغ سمجھتے رہے (علی گڑھ میگزین مرتبہ جاں نثار اختر مقالہ اردو ادب کے جدید رجحانات۔ از علی سردار جعفری) لیکن بعد میں اسے اپنانے لگے۔ البتہ پنجاب والوں کی آزاد نظم سے ذرا مختلف۔ نہ تو راشد کا منجھا ہوا طرز اور نہ میراجی کا مبہم انداز بلکہ انھوں نے ایک طرف تو آزاد نظم کو بہت کچھ کرا اس میں ایک بہاد پیر کیا۔ دوسری طرف معنوی اعتبار سے اس میں وضاحت اور جوش کی شاعری کا ایجان اور غیظ و غضب دونوں کو سمونے کی کوشش کی۔ اس طرح ایک نیا راستہ نکل آیا یعنی اب تک عام طور پر سیاسی نظمیں لکھنے والے آزاد نظم نہیں لکھتے تھے۔ اب سیاسی نظم لکھنے والوں نے بھی اس صنف کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ معین احسن جذبی کی شاعری کا انداز ان شعرا میں بڑا متوازن تھا۔ ایک طرف تو انھوں نے قدیم ادب کی تمام روایات کو اپنانے کی کوشش کی، دوسری طرف جوش کے اثر سے بھی نکل گئے۔ صرف ایک نظم ”اے سپاہی کھینچ اپنی خوں فشان تلوار کھینچ“ لکھی تھی۔ (آزادی کی نظمیں مرتبہ سبط حسن) لیکن اسے بھی اپنے مجموعہ کلام میں شامل نہیں کیا۔ جذبی کی شاعری عام طور پر ان بے اعتدالوں سے پاک ہے جو ہمارے جوشیلے نوجوانوں کی شاعری میں ملتی تھی، اسی لئے ان کو دونوں طبقوں میں پسند کیا جاتا تھا۔ فیض احمد فیض کی شخصیت بھی شروع سے متوازن

رہی ہے۔ لہذا انھوں نے جذبی سے ایک قدم آگے بڑھ کر پُرانی انداز بیان کے ساتھ جدید انگریزی شاعری کے اثر سے حسین تجربے کرنے کی کوشش کی۔ خاص طور پر پابند نظموں میں عام نظموں سے ہٹ کر بندوں کی ترتیب اور بعض مصرعوں اور قافیوں کو نئے انداز سے استعمال کر کے تازگی پیدا کی۔ نظم معریٰ کو بھی انھوں نے اپنایا۔ لیکن انھوں نے اسے سلیقے سے برتا اور اس کو تراش تراش کر اس قابل بنایا کہ پُرانی لوگ اس پر ناک بھول نہ چڑھائیں۔

لیکن زمانہ میں ایک عجیب ہوا چل رہی تھی۔ فیض اور جذبی کا معتدل انداز عام نوجوان شاعروں کو زیادہ پسند نہیں آتا تھا اور نہ اس کی تقلید کی جاتی تھی۔ تقلید کے تو صرف دو ہی محور تھے جوش اور میراجی۔ جاں نثار اختر اور شمیم کرہانی مکمل طور پر جوش کے رنگ میں رنگ چکے تھے مخدوم محی الدین اپنے سیاسی کاموں کی وجہ سے آہستہ آہستہ شاعری سے دست بردار ہو رہے تھے۔ علی جواد زیدی "اندیشہ سود و نیاں" کا شکار ہو کر غیر شاعر ہو چکے تھے۔ اب باقی رہے اور شعراء تو ان میں احمد ندیم قاسمی کے یہاں اقبال، جوش، اختر شرانی اور اختر انصاری اور بعض دوسرے شعراء کا علا جلا رنگ تھا۔ البتہ ان کے یہاں وضاحت بھی تھی اور صحت مند خیالات بھی اور آہستہ آہستہ انفرادیت پیدا کرنے کی کوشش بھی تھی۔ کیفی عظمیٰ کی شاعری میں پُرانی روایات سے فائدہ اٹھایا گیا تھا یعنی مسدس، مرثیہ اور اقبال کے "شکوہ" والی طرز سے لیکن انکی نظموں کا تبلیغی انداز ایسا تھا کہ بعض وہ لوگ جو سیاسی طور پر ان کے ہمنوا تھے اسے بہت پسند کرتے تھے اور اسی بنا پر کیفی کو عوامی شاعر، انقلابی شاعر مزدوروں کا شاعر کہہ کر پکارتے لیکن دوسرے لوگ اس کو پروپیگنڈہ اور سطحی شاعر کہہ کر اس کو کڑی نگاہوں سے دیکھتے۔

میں ۱۹۴۴ء میں علی گڑھ آیا تو یہاں مجھے فراق کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ "اندازے" پڑھنے کا اتفاق پہلی بار ہوا۔ اس کے دیباچے میں ایک فقرہ دیکھ کر میں چونک پڑا۔ فراق نے دیباچے کے شروع ہی میں ایسن کا ایک جملہ نقل کیا ہے کہ "جب بازار میں کوئی نئی کتاب مقبول ہوتی ہے تو میں فوراً کوئی پُرانی کتاب پڑھنے کے لئے اٹھا لیتا ہوں"۔ اس جملے کے ساتھ ہی میں نے پوری کتاب پڑھ ڈالی۔ فراق کا ہماری تنقید نگاری میں جو بھی مرتبہ ہو اس وقت یہ بحث میں نہیں چھیڑنا چاہتا لیکن میں اپنا یہ تجربہ بیان کر دوں کہ فراق کے "اندازے" نے پہلی بار مجھے پُرانی شاعری کا چسکا دلایا اور ایسا معلوم ہوا کہ ہمارے پُرانے ادب میں بھی ایسے بیش بہا خزانے ہیں جن سے نہ صرف ہم لطف اٹھا سکتے ہیں بلکہ اسے اپنی ملکیت اور اپنی دسترس میں لاسکتے ہیں۔ سچ کہئے تو وہ شاعری جسے میں گل و بلبل کی شاعری سمجھ کر نظر انداز کر دیتا تھا، اب اس میں کبھی مزہ آنے لگا۔ اس کے نئے نئے مفہوم نکلتے گئے۔ بہت سے اشعار ایسے ملنے لگے جو آج کے حالات پر بھی صادق آتے تھے۔ اس زمانہ میں دو تین سال تک میرا یہ حال رہا کہ نئے رسالوں کو تو سرسری طور پر دیکھ لیا کرتا تھا، لیکن دلی، امیر قایم، مصحفی، آتش، انیس، میر حسن، مرزا شوق، سودا، درد، غالب، ذوق، مومن، داغ، حسرت موہانی، شاد عظیم آبادی، حالی، اکبر، چکبست اور اقبال کے کلام میں کھویا رہا، اس وقت میں نے شاعری شروع ہی کی تھی اور ٹوٹی پھوٹی چند ہی نظمیں لکھی تھیں جن میں سے بعض پر فیض اور مجاز اور بعض پر راشد کا اثر تھا۔ علی سردار جعفری کی "نئی دنیا کو سلام" شائع ہوئی تو اس نے بھی تھوڑی دیر کے لئے مجھے اپنی طرف کھینچا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے ابھی راستہ میں اندھیرا ہے اور روشنی بھی کچھ دور پر ہے۔ میں نے پُرانی شاعری کو پڑھ کر غزلیں لکھنے کی کوشش کی تو مجھے ایسا معلوم ہوتا کہ جیسے میرے اشعار خود میری نگاہوں میں کھٹک رہے ہیں۔ ان میں وہ ضبط اور وہ سنجیدگی نہ آسکی جس کی وجہ سے شعریں صفائی اور حسن پیدا ہو جاتا ہے۔ آخر عاجز آ کر کچھ دنوں تک میں نے غزلیں لکھنی کم کر دیں اور مختلف انداز کی نظمیں لکھنے کی کوشش کرتا اور بہتر سے بہتر راستے کی تلاش کرتا تاکہ ان نظموں کو لوگ پسند کریں۔ پھر بھی سچی بات یہ ہے کہ کچھ بات نہیں بنتی تھی۔ اس زمانہ میں تو اس کا سبب سمجھ میں نہ آتا تھا لیکن اب اس کا تجزیہ کرتا ہوں تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اچھا ہوا میں نے غزل کوئی کچھ دنوں کے لئے ملتوی کر دی کیونکہ اچھی غزل لکھنے کے لئے ذہنی بلوغ اور ضبط توازن بہت ضروری ہے۔ کچی عمر اور جذبات میں بیجان دونوں کا میاب غزل اور بھرپور شعر کے لئے مائع ہیں۔ ایسی صورت میں اس کے علاوہ کچھ نہیں ہو سکتا کہ نظموں جیسے پلے پھلے ردائی شعر ہوں یا پھر روایتی شاعر ہو کر رہ جائے۔ پہلے زمانہ میں جب بہت زیادہ اصرار سخن کا رواج نہیں تھا اور شاعر غزل ہی سے اپنی شاعری کا آغاز کرتا تھا تو آٹھ دس سال تک اس کو صرف مشق کرتے گزر جاتے تھے اس

درمیان میں اس کے اشعار صحیح معنوں میں جذبات یا تجربات کو بھی نہیں سموسکتے تھے بلکہ کتابی خیالات کو شاعر قافیوں کے سہارے روایتی طور پر بانڈھتا تھا، البتہ بعد میں جب شعور بچتے ہو جاتا تو پھر اصلی شاعری اور تخلیقی عمل تک اس کی رسائی ہوتی تھی۔

پرانے اور نئے ادب کی آویزش کے سلسلہ میں میرا ذہن صاف ہو رہا تھا اور یہ بات مجھ پر واضح ہو رہی تھی کہ پرانے اور نئے ادب میں کوئی دشمنی نہیں بلکہ دراصل باضی حال اور مستقبل تینوں ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں ان میں سے کسی ایک سے بھی رشتہ توڑ لینے میں اپنا ہی گھٹا ہے اور اپنے آپ کو ایسے بھنور میں ڈال دینا ہے جہاں ڈوبنا یقینی ہے میں یہ بات اور بھی بہت سے دوستوں اور ساتھیوں پر واضح کرنے کی کوشش کرتا کچھ لوگوں کی سمجھ میں یہ بات آتی، کچھ لوگوں کی سمجھ میں نہ آتی۔ اس درمیان میں دو چیزیں اور میری نظر سے گزریں ایک تو سجاد ظہیر کی حیدر آباد اردو کانگریس کی تقریر جس میں انھوں نے صاف صاف ترقی پسند ادب اور نیا ادب کو علیحدہ کر دیا تھا اور اعلان کر دیا تھا کہ ترقی پسندی کا تعلق فن کی بے راہ روی روایتوں سے یکسر بغاوت اور مریضانہ خیالات سے بالکل نہیں ہے۔ بلکہ فتنہ خیالات اور جمہوری کے جذبات و احساسات ہیں اور وہی شاعر صحیح معنوں میں ترقی پسند ہے جو صالح اقدار کی ترجمانی کرتا ہے اور زندگی کے حقائق کو سائنٹفک انداز میں دیکھتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک بار اتفاق سے مجھے نیا ادب کی پہلی فائل مل گئی۔ اب تک یہ میری نظر سے نہیں گزری تھی۔ پہلے پرچے (اپریل ۱۹۵۷ء) میں جو اور یہ ہے اور اس میں مجھے یہ باتیں ملیں۔

”ہمارے نزدیک ترقی پسند ادب وہ ہے جو زندگی کی حقیقتوں پر نظر رکھے۔ ان کا پر توہ ہو۔ ان کی چھان بین کرتا ہو اور ایک نئی اور بہتر زندگی کا راہبر ہو لیکن وہ صرف زندگی کی لچل اور ہچان ہی کا نقیب اور نبض شناس اور راہبر نہیں ہوتا۔ وہ صرف سچے پر کروٹیں لینے والی موجوں ہی کے ساتھ نہیں بہتا بلکہ زندگی کی گہرائیوں میں جا کر ان خاموش اور پچھے داروں سے بھی سیراب ہوتا ہے جو سطح سے نیچے بہتے ہیں فوراً میرا ذہن جوش اور ان کے مقلدوں پر گیا اور میں نے سوچا کہ ۱۹۳۹ء میں نیا ادب کے ادارے میں یہ بات کہی گئی تھی لیکن اس نقطہ نظر سے کسی نے جوش کو پرکھنے یا ان کی شاعری کے اس حصے پر انگلی رکھنے کی کوشش نہیں کی۔ عام طور پر ہمارے ترقی پسند جوش ہی کو اپنا رہنما مانتے تھے اور جوش کی تقلید کرنا فخر سمجھتے تھے۔ آخر کوئی نقاد آگے بڑھ کر جوش کی شاعری پر تنقید کیوں نہیں کرتا، اور ان کی جذباتیت کی قلعی کھول کر یہ کیوں نہیں بتاتا کہ اس کا اثر ادب پر دیرپا نہیں ہوتا تاکہ آنے والے نئے شعرا اس سے خبردار ہو جائیں۔ آخر جون ۱۹۳۷ء کے آج کل میں مجھے فیض احمد فیض کا ایک مضمون ”جوش شاعر انقلاب کی حیثیت سے“ مل گیا۔ جس میں مجھے اپنے خیالات کی مکمل تائید ملی اسی وقت سے میں فیض کی سوجھ بوجھ کا قابل ہو گیا۔ ہاں ایک بات کہنی میں بھول ہی گیا نیا ادب کے پہلے ہی پرچے کے ادارے میں مجھے ایک اور بات بھی مل گئی کہ:۔۔۔ ”ترقی پسند ادب قدیم ادب سے ناتا نہیں توڑتا۔۔۔ وہ پرانے

ادب کی روایتوں کا حامل ہوتا ہے اور انھیں روایتوں کی بنیاد پر نئی جماعتیں کھڑی کرتا ہے۔ زیادہ عالی شان اور زیادہ کارآمد ترقی پسند ادب ہی دراصل قدیم ادب کا سب سے مستبرائین اور متحقی وارث ہے۔“

ان خیالات کو ابھی میں اپنے ذہن میں مجتمع کر ہی رہا تھا اور ابھی پورے طور پر مضمون بھی نہیں کر پایا تھا کہ ۱۹۳۷ء میں ہندوستان کے دو ٹکڑے کر دئے گئے اور ہماری تاریخ ایک ایسے موڑ پر آگئی جہاں پہونچ کر افراتفری اور بحران ناگزیر تھا، فرقہ وارانہ فسادات نے ہمارے ادیبوں اور شاعروں کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ترقی پسند ادیب اس جنگ کا مہم ظلمت میں انسانیت کی مشعل لے کر آگے بڑھنا چاہتے تھے لیکن کچھ ادیبوں نے پاکستان میں گھم گھلا رجعت پسندی اور فرقہ واریت کا علم بلند کرنا شروع کیا اور ایسی نظمیں اور افسانے لکھنے لگے جس میں تعصب اور مریضانہ رجحان کی پوری کارفرمائی ہوتی۔ سعادت حسن منٹو کی حد سے بڑھی ہوئی انانیت اور بے راہ روی اپنا رنگ لائی اور انھوں نے ”سیاہ حاشیوں“ سے اردو ادب کو ڈھک دینا چاہا اور ان کے دس روپے میں حسن عسکری کے ساتھ جو تقسیم سے پہلے ہی رجعت پسندی کا دلدل میں کھنس چکے تھے ممتاز شیریں، محمد شاہین، قدرت اللہ شہاب، انتظار حسین اور دوسرے کئی ادیب بھی شامل ہو گئے۔ انھوں نے خالص حقیقت نگاری کے نام پر اپنے ہیمنہ جذبات کی تسکین چاہی اور تعصب میں اندھے ہو کر اصلیت کا

ان میں سے کچھ لوگ تو نظم نگاری بالخصوص آزاد نظم نگاری سے تائب ہو کر روایتی غزل گوئی کی طرف مائل ہو گئے ہیں۔ کسی صنف کی طرف بھاگنے سے ذہنی سانچہ نہیں بدل جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ غزل بھی ترقی پسند شاعروں ہی کے ہاتھوں نکھر رہی ہے۔ یہ سچ ہے کہ کچھ دنوں تک کچھ توجہ کی دھن میں اور کچھ جوش کے اثر سے ہمارے ترقی پسند شعرا نے غزل کو ایک مردہ صنف سخن سمجھ لیا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ نیا ادب میں جذباتی اور مجاہد کی غزلیں بھی ”نظم“ کے عنوان سے شائع ہوتی تھیں اس زمانے میں اختر حسین رائے پوری کی تنقیدوں سے متاثر ہو کر بھی ہمارے نوجوان قدیم ادب کو پیٹ بھروں کی ملکیت اور ناکاروں کی شاعری سمجھتے تھے یہی انھیں بلکہ ٹیگور اور اقبال کو رجعت پسند اور فاشسٹ بلکہ ان کا کلام پڑھنے سے روکا جاتا لیکن شکریہ کہ سجاد ظہیر، فیض احمد فیض اور فراق گورکھپوری کی تنقیدوں اور تحریروں سے آہستہ آہستہ یہ رجحان کم ہو گیا۔ جوش تو خیر اب بھی اپنے خیال پر اڑے ہوئے ہیں اور غزل کو گردن زدنی سمجھتے ہیں، لیکن ان میں ان کا کوئی قصور بھی نہیں ہے۔ وہ اپنے مزاج کے اعتبار سے ایک رومانی اور پرجان پسند آدمی ہیں اس لئے ان کی شاعری میں ضبط اور فکر دونوں کی کمی ہے وہ صرف احتجاج کر سکتے ہیں تعمیر کا ان کے پاس کوئی تصور نہیں اسی لئے ان کی انقلابی شاعری بھی اشتراکی نقطہ نظر سے صحیح معنوں میں انقلابی شاعری نہیں ہے بلکہ رومانی شاعری کا ایک روپ ہے جس میں عینیت اور اتار کز م دونوں کی فراوانی ہے۔

خیر جوش کی شخصیت ان خامیوں کو جذب کر کے اس قدر پختہ ہو چکی ہے کہ اس میں کسی قسم کی تبدیلی کا امکان مشکل سے پیدا ہو سکتا ہے لیکن نئے شاعروں کے شعور نے جوش کی اس خامی کو پرکھ لیا ہے، جن شاعروں نے جوش کی اندھا دھند تقلید کی تھی وہ آج تک ہزاروں موضوعات پر نظمیں لکھنے کے باوجود اپنی آواز نہیں پیدا کر سکے اور نہ تخلیق کے وہ نمونے پیش کر سکے جو اپنی دلکشی کی بنا پر زندہ رہنے والے ہوں، جیسے جہاں نثار اختر، شمیم کرہانی وغیرہ لیکن جدید تر شعراء جو ترقی پسند حلقے سے تعلق رکھتے ہیں ان کے ذہن میں یہ بات صاف ہو گئی ہے کہ انھیں میر و مصطفیٰ، غالب، بومن، حسرت و اقبال سے بہت کچھ حاصل ہو سکتا ہے۔ وہ تلسی داس، میرا بابی، سورداس، رس خان، امیر خسرو، ملک محمد جاسی، ٹیگور اور دنیا کی دوسری زبانوں کے قدیم شعراء کو پڑھ کر جتنا حاصل کر سکتے ہیں اتنا جوش انھیں نہیں دے سکتے۔

جدید تر شعراء کے اس رجحان کو تقویت دینے میں اس وقت دو شخصوں نے کافی مدد کی ہے، آج سے دو تین سال بیدی اور شہساز رحیم وغیرہ کے خیالات سے بھر ایک غلط رجحان پرورش پا رہا تھا کہ ہمارا ماضی کا ادب بیکار ہے لیکن سجاد ظہیر نے بروقت اسے ٹوکا اس سے ذرا پہلے ہی ممتاز حسین نے ماضی کے ادب عالمیہ پر مقالہ لکھا تو مجاز اور مجبئی گروپ کے کچھ انتہا پسند مضمون نگاروں نے ان پر رجعت پسندی اور احیا پرستی کا فتویٰ صادر کر دیا لیکن ممتاز حسین نے علمی بنیاد پر اپنی بات منوالی۔ اس درمیان میں سجاد ظہیر اور فیض احمد فیض پاکستان میں قید و بند کی مصیبتیں جھیلنے کے لئے ہم سے دور ہو گئے تو انھوں نے جا کر پھر ہمارے ادب کو ایک روشنی دکھائی فیض نے سودا اور بعض دوسرے شاعروں کو پڑھا اور ماضی کے ادب کی اعلیٰ روایات کو جذب کر کے بڑی عمدہ غزلیں اور نظمیں لکھیں۔ سجاد ظہیر کی بہت سے خطوط شائع ہوئے جس میں انھوں نے لکھا کہ وہ آج کل سودا اور دوسرے کلاسیکی شاعروں کو پڑھ رہے ہیں۔ اس طرح ہمارے لئے ایسے بول کے ذہن سے رفتہ رفتہ یہ غلط فہمی دور ہو گئی کہ ماضی کا ادب بیکار ہے۔

ابھی تک ہمارے بعض ساتھی ایسے بھی ہیں جو اس مسئلے پر بار بار لکھ جاتے ہیں۔ وہ ماضی کے ادب کو بھی اپنے نظریے کی ترازو میں تولتے ہیں اور جب دیکھتے ہیں کہ اس میں روحانیت و تصوف ہے ماورائیت اور غم انگیزی ہے۔ اخلاق کی پرانی اقدار ہیں تو وہ پھر کہنے لگتے ہیں کہ چونکہ آج یہ نظریات بدل چکے ہیں اور ہم ایک نئے نظریے اور نئی اقدار کے حامل ہیں اس لئے ہمارے واسطے اس ادب میں کوئی کیف و اثر نہیں یہ ادب صرف الماری کے خانوں میں بند ہونے کے لائق ہے جسے صرف ادبی تاریخ مرتب کرنے والے ریسرچ اسکالرز ہوا پڑھیں گے یہ لوگ دراصل پیبول جاتے ہیں کہ ادب اور آرٹ ایک تخلیقی عمل ہے یہ ضرور ہے کہ ادیب و شاعر کسی کسی نظریے میں یقین رکھتا ہے لیکن بنیادی طور پر ادب کی تخلیق زندگی کے حقیقی تجربات پر ہوتی ہے اور اس ”خون جگر“ کی وجہ سے جو اچھے شاعر کو انسان کی بنیادی اقدار،

ہر خلوص طور پر وابستہ کر دیتا ہے اس لئے جب اس کے احساسات آرٹ کے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں تو ان میں نظرئے سے آگے بڑھ کر وہ ادبی اق
جذب ہو جاتی ہیں جن کی بنا پر اس کی دلکشی کبھی ختم نہیں ہوتی۔ اگر ایمانہ ہوتا تو آج کا لیداس کو کون پڑھتا جس کے یہاں دیوی دیوتاؤں کا تصور
وہ تمام ادب جو یونانی دیو مالا کو سامنے رکھ کر لکھا گیا ہے اسے آج کوئی نہ پوچھتا۔ ہومر، شکسپیر، گوٹے، ملٹن اور دالمیک آج زندہ نہ رہتے۔
ہمارے اس قسم کے نوجوان دراصل زیادہ مطالعہ اور سوچ بچار کی زحمت گوارا نہیں فرماتے ورنہ انھیں معلوم ہوتا کہ خود کارل مارکس پرانے شعراء
کا بڑا دلدادہ تھا اور آج بھی سویت یونین میں نظامی گنجوی کی برسی منائی جاتی ہے اور ہندوستان کے مہاکوی تلسی داس کی یادگار میں جیسے
کئے جاتے ہیں اور ان کی تصانیف کے ترجمے شائع ہوتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر ستم ظریفی اور کیا ہو سکتی ہے کہ خود روس میں ہندوستان کے
صدیوں پرانے شاعر سے لوگ فائدہ اٹھائیں اور ہمارے یہاں کے نوجوانوں کو تیر و غالب کے اندر فرسودگی کی جھک آئے۔

فیض کی "دست صبا" کی اس لحاظ سے ہماری شاعری میں بڑی اہمیت ہے کہ اس نے ہمارے ادب کی مٹی ہوئی، ان روایات کو
زندہ کیا ہے جنہیں کبھی نہ مرنا چاہئے۔ اب ہمارے یہاں کا عام ترقی پسند شاعر کچھ سوچ بچار سے کام لینے لگا ہے۔ ماضی کے ادب کو پڑھ رہا ہے
اور نئے تجربات کی بھی چھان بین کر رہا ہے۔ تمام ترقی پسند شعراء آزاد اور وابستہ نظموں کے علاوہ کامیاب اور خوبصورت غزلیں بھی لکھ رہے ہیں
بعض نے اگرچہ ابھی تک اپنی غزل کو صرف سیاست تک محدود رکھا ہے لیکن بالکل نئے شاعر اس رجحان سے مکمل رہے ہیں۔ اس موقع پر کچھ
غلط فہمیاں بھی بعض لوگوں میں پیدا ہو رہی ہیں اور کچھ غلط فہمیوں کو ناکام رجعت پسند ہوادے رہے ہیں وہ یہ کہ جدید شاعری کا تجربہ
چونکہ ناکام رہا اس لئے ترقی پسند شاعر اس شاعری سے تائب ہو کر غزل گوئی پر اتر آئے ہیں۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ اعلیٰ شاعری
اور کلاسیکی ادب کا تعلق غزل یا کسی ایک صنف سے نہیں ہے۔ پرانے زمانہ میں بھی غزل کے علاوہ قصیدہ، ہجو، مثنوی، مسدس، مخمس وغیرہ
تمام اصناف کلاسیکی اور معیاری اصناف سمجھی جاتی تھیں اور موضوع اور موقع محل کے اعتبار سے ان اصناف کو استعمال کیا جاتا تھا۔ البتہ
ان اصناف کو برتنے میں فنی ریاضت کی ضرورت ہمیشہ پڑتی تھی اگر اپنی شاعری میں بندی پیدا کرنی ہے اور آج بھی میرا یہی خیال ہے کہ ہمیں
تمام اصناف کو اپنے تصرف میں رکھنا چاہئے۔ آزاد نظم کو اگر سلیقے سے برتا جائے اور ضبط و نظم اور تعمیر سے کام لیا جائے تو بیانیہ ڈرامائی اور
فکری شاعری کے لئے یہ صنف بہت موزوں ہے۔ اس صنف سے اب ایک حد تک لوگ مانوس ہو چکے ہیں اس لئے اب برکنے کا سوال نہیں
لیکن اس کو چابک دستی کے ساتھ برتنے کی ضرورت ہے۔ اس وقت اس صنف میں بھی وہ شاعری تخلیق ہوگی جسے ہم کلاسیکی شاعری کہہ سکیں گے
اور جو اپنی ادبی اقدار کے بل بوتے پر ہمیشہ زندہ رہے گی۔

جدید شعراء میں فیض، جذبی اور سردار جعفری کے علاوہ احمد یحیٰ قاسمی، اختر الایمان، ظہیر کاشمیری، مجروح سلطان پوری،
شاد عارفی، دامت چمنپوری، نبیب الرحمن، قتیل شفائی، ساحر لدھیانوی، کیفی عظمیٰ، جمیل مظہری، پرویز شاہدی، اور ڈاکٹر مسعود حسین
وغیرہ کے کلام کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات واضح طور پر ہمارے سامنے آتی ہے کہ ان شعراء نے حتی الامکان اپنے فن کو خوبصورت اور پائدار
بنانے کی کوشش کی ہے۔ کسی نے قدیم ادبی روایات سے فائدہ اٹھا کر اس میں آب و رنگ بھرا ہے، جیسے شاد عارفی اور کیفی عظمیٰ وغیرہ
بعض نئے نئے اسلوب میں اپنی فکر کی سنجیدگی سے گہرائی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے جیسے اختر الایمان، جمیل مظہری نے اگرچہ اپنے آپ کو
کسی ادبی تحریک سے باقاعدہ وابستہ نہیں کیا لیکن ان کے یہاں ترقی پسند خیالات اور صحت مندر ادبی اقدار کا بڑا اچھا امتزاج ملتا ہے۔ ان کے
کلام میں قدیم ادب کی سنجیدگی اور نئے افکار کی روشنی دونوں موجود ہے۔ فیرب الرحمن نے "ساتی نامہ" اور "شہر آشوب" جیسی پرانی اصناف
میں نئے مسائل، نئے نظریات اور نئے دور کی ترجمانی کی ہے اور تمام فنی آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے آزاد نظموں میں بھی فیرب الرحمن کی نظمیں
مثال کے طور پر پیش کی جا سکتی ہیں۔ پرویز شاہدی ایک عرصہ تک گوشہ گمنامی میں رہے اور ان کا کلام منظر عام پر نہ آ سکا لیکن اب اس کی روشنی
سے نئی شاعری میں ایک آجلا ہوا ہے۔ ڈاکٹر مسعود حسین نے ہندی سنسکرت کے مطالعہ کے بعد "گیت" لکھے اور اس کے رس کو اردو
والوں تک پہنچایا۔ کئی خوبصورت آزاد نظمیں لکھی ہیں جن میں فن کو ملحوظ رکھا گیا ہے، حال ہی میں ایک قصیدہ لکھا ہے جو ابھی غیر مطبوعہ ہے

میں میں قصیدے کی تکنیک میں نئے مسائل کو سمجھا ہے اور بڑی خوبصورت تخلیق کا نمونہ پیش کیا ہے۔

غرض ہمارا شعروادب کا قافلہ اب آہستہ آہستہ اس منزل کی طرف بڑھ رہا ہے جہاں بحرانی اور تجرباتی دور سے گزر کر شاعر کو اپنی تہیہ فکری صلاحیتوں کے جوہر کو پورے طور پر دکھانے کا موقع ملتا ہے۔ جدید تر شعراء میں غلام ربانی "آباں"، تیغ الہ آبادی، ظہور نظر، غلام رضا تہی، حمایت علی شاعر، منظر سلیم، عبدالعزیز خالد، باقر جمہدی اور حسن نعیم وغیرہ اچھی نظمیں اور غزلیں لکھ رہے ہیں اور قدیم و جدید کے مزاج کے اپنی شاعری کو آب و رنگ دے رہے ہیں۔ یہاں نامناسب نہ ہوگا اگر چند بالکل نئے شاعروں کا ذکر کردوں جن کے کلام بار بار سننے اور دیکھنے کا مجھے اتفاق ہوا ہے اور حیرت ہوتی ہے کہ بالکل نووارد شعراء کے یہاں بھی اب سنجیدگی اور ضبط اور فن کی خوبصورتی آ رہی ہے جو ایک عرصہ کی مشق و ریاضت اور ذہنی تربیت کے بعد ملا کرتی تھی۔ یہ شعراء نظمیں بھی لکھتے ہیں، غزلیں بھی۔ غلام اصناف میں طبع آزمائی کر رہے ہیں اور ہر طرح ہمارے ادبی سرمائے میں اضافہ کر رہے ہیں ان کی نظمیں پیش کرنے کا اس مختصر مضمون میں موقع نہیں ہے لیکن غزلوں کے چند اشعار ضرور سنا دینا چاہتا ہوں :-

عیا وید کمال :-
نسیم صبح گرفتار گیسوے شب ہے
چمن میں مرثدہ ٹھہر بہار لائے کون ✓
کے ہیں سر جو قلم ہم نے شہر یاروں کے
یہ خوں بہا ہے شہیدوں کا انتقام نہیں
کلی جب بھی چٹکتی ہے تو یہ آواز آتی ہے
نوید گل کی خاطر جانی دیدنی ہی پڑتی ہو
لگاؤٹ ہر قدم پر تاکہ زہر آگہی پی لوں
زمانہ کیا نرالی چال چلتا جائے ہے مجھ سے
شہزاد جعفری :-
حسن حیراں ہے کہ اب دعوتِ نظارہ پر
اہل دل جرات انکار رنگ آپہونچے ہیں ✓
اکثر جو گم رہی میں چھٹا دامن جنوں
مجھ پر مرے ہی نقش قدم خندہ زن سے ✓
میں تلخی غم دوراں کی لاج رکھ لوں گا
عم زمانہ غم دل سے کیا بُرا ہوگا ✓
کچھ ہو کے رہے گا آپ کے برس تم موسم گل تو آنے دو
یام ہی رہیں اس گلشن میں یا گلشن کے عیا دہیں ✓
جنہیں پسند نہ تھا ظلم ناروا انور
وہ آج ہو گئے اپنے ستم پہ خود منتوں

یہ صرف ان شعراء کی مثال ہے جنہیں مجھے علی گڑھ میں سننے کا اتفاق ہوا ہے اس طرح ہندوستان میں جو نئی نسل اُٹھ رہی ہے اس کے یہاں ایک سنبھلی ہوئی کیفیت اور شعور ملتا ہے۔ رسالوں میں نئے نئے ناموں کو چھوڑ کر جو لوگ آگے بڑھ جاتے ہیں ان سے مشورہ نہ لیجئے بلکہ خود آپ تنقیدی نظر سے دیکھیں گے تو آپ کو محسوس ہوگا کہ مجموعی طور پر ہماری شاعری آگے بڑھ رہی ہے۔ ہم نے یہ منزل بہت سربانیوں کے بعد حاصل کی ہے۔ ہم جتنے ضرور ہیں لیکن خلوص کو کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ اسی لئے حقوڑا سا فن کا ثنوں کرنے کے بعد بھی ہم سچائی کا دامن تھامے رہے اور اسی کے سہارے ہم نے اپنا راستہ پایا، آخر میں آمل احمد سرور کی "تازہ ترین غزل" کا یہ شعر ان تمام حضرات کو سنا دینا چاہئے جو اپنے ادبی کارناموں میں شکست کھا کر پورے اردو ادب سے مایوس ہو گئے ہیں۔

تمھاری مصلحت اچھی کہ اپنا یہ جنوں بہتر
سنبھل کر گرنے والو ہم تو گر کر سنبھلتے ہیں ✓

خلیل الرحمان اعظمی "مختص" - ترقی پزیر

(قومی آواز)

مذاکرات نیاز

یعنی حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے ایک بار اس کو شروع کر دینا اظہار تک پڑھ لیتا ہے۔ یہ بھی جدید ادب کی ہے جس میں صحت اور انفاست کا غلط طبع کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

منیجر نگار لکھنؤ

عہد مغلیہ کے باغ و راع

اس وقت تک جس طرح اور بہت سی ہندوستانی صنعتوں پر تاریخی حیثیت سے کوئی اعتناء نہیں کیا گیا۔ اسی طرح **معماری** ایک فن باغبانی بھی ہے جو قابل لحاظ نہیں سمجھا گیا۔ حالانکہ شاہان مغلیہ کے باغات کی صنعت و خوبی شاہان مغلیہ کی عمارتوں کی جہان اور ہندوستانی کاریگروں کی صنایعوں کی بنیاد قرار دی گئی ہے۔

مشرقی فن ہندوستان (Hindustani Art) کی یہ خصوصیت اور کہیں نہیں پائی جاتی کہ باغ کے اندر مکانات کی تعمیر مقامی آب و ہوا کے لحاظ سے کی جاتی ہو۔ اور مشکل سے کوئی استثناء اس میں نظر آتا ہے۔

مغرب کے مشہور سیاح برنیر جو عہد مغلیہ میں ہندوستان آیا تھا، ایک قلعہ شاہی کا حال بیان کرتے ہوئے اپنے سفر نامہ میں لکھتا ہے کہ قلعہ کے اندر کی محل سرا و دیگر عمارت شاہی قرانس یا رومہ الکبریٰ کی عمارتوں کی طرح طیار نہیں کی گئی ہیں اور نہ ان عمارت کے دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یورپ کے فن تعمیر کا کوئی بھی اثر ہندوستانی کاریگروں پر پڑا ہے بلکہ یہاں آب و ہوا کی مطابقت سے عمارتیں طیار کرائی جاتی تھیں اور اب بھی ہندوستانی باغات میں جو محل مسمار ہونے سے رہ گئے ہیں ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانی آب و ہوا کا لحاظ رکھتے ہوئے ان محلات سے زیادہ خوبصورت و شاندار عمارتوں کا بنوانا ممکن تھا۔

یورپ میں اب تک یہی غلط فہمی چلی جا رہی ہے کہ ہندوستان کے لوگوں میں تعمیر کا مادہ نہیں ہے۔ چنانچہ نئی دہلی کی تعمیر کے وقت بہت دنوں تک یہی شے ہو سکا کہ آیا یورپین انداز پر تعمیر کی جائے یا ہندوستانی اصول کو مدنظر رکھا جائے۔

فرگوسن اپنی کتاب ”ہندوستانی تعمیرات“ میں یہاں کی صنعت و حرفت کا ذکر کرتے ہوئے تحریر کرتا ہے کہ ہندوستان میں فن تعمیر معدوم نہیں ہو گیا ہے بلکہ وہ ایک زندہ صنعت ہے اور انھیں اصول پر اب تک قائم ہے جن کی پابندی بارہویں اور تیرھویں صدی کے مغربی معمار کرتے تھے۔

وہ لوگ جنہوں نے نفسیاتی طریق پر تاریخ کا مطالعہ کیا ہے ان سے یہ امر پوشیدہ نہیں ہے کہ ہندوستانی صنایع پر حوادث تاریخی کا بہت گہرا اثر پڑا ہے اور یہاں کی ایک ایک یادگار اس تاثر کی کھلی ہوئی نشانی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عہد ہنود اور عہد بودھ کے آثار تعمیر میں اتنا ہی فرق نظر آتا ہے جتنا عہد مغلیہ کی عمارت میں اور پھر یہ بات صرف ہندوستان ہی میں نہیں ہے بلکہ تمام مشرق میں تمھیں اس کا جلوہ نظر آئے گا۔

غور کرنے سے اس کی وجہ صرف یہ معلوم ہوتی ہے کہ مشرق کی کوئی صنعت ایسی نہیں ہے جس میں وقت و مقام کے لحاظ سے وہاں کی مذہبی خصوصیت کو نظر انداز کر دیا گیا ہو۔ چنانچہ تم دیکھو گے کہ کسی مشرقی صنعت کا مقصود صرف اظہار صنعت و حسن نہیں ہوتا، بلکہ اس کی تہ میں ایک سرسبز راز، ایک مخفی مقصد، ایک چھپی ہوئی روحانیت پائی جاتی ہے۔ ایک ایک پھول ایک ایک پتہ، ہر ہر نقش اور ان کی صنعت کا ہر پہلو و خم خواہ وہ تمھیں کاغذ پر نظر آئے یا زمین پر، دیوار پر نمایاں ہو، یا کپڑے پر ایک مخفی معنی اپنے

اندروں رکھتا ہے اور اس کو وہی سمجھ سکتا ہے جس نے مشرقی روح کا غائر مطالعہ کیا ہے اور حقیقی معنی میں ان کی روحانیت سے وابستہ ہو گیا ہے۔

مغرب میں اب تم اس حقیقت کو بالکل مفقود پاؤ گے۔ البتہ بارہویں اور تیرہویں صدی میں جب صنعت کا تعلق مذہب سے تھا تو اس کا یوروپیون صناعتوں اور ان کی صنعت پر بھی پڑ رہا تھا اور یہی وجہ ہے کہ اس عہد کی مغربی عمارتیں آج تک عزت کا نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔

سین ماضیہ کے باغ نہایت قديم زمانہ میں بھی ہندوستان کے اندروں درختوں اور پھولوں کا عزیز ہونا ثابت ہوتا ہے، چنانچہ سنسکرت کے ناموں میں موسم بہار کی تعریف، سبزہ کا پہلنا، دریا کی آئینہ، برسات کے خود درختوں کی کیفیت، صبح و شام کے سہاؤ نے مناظر کا بیان نہایت پر لطف طریقہ سے کیا گیا ہے۔

حضرت عیسیٰ سے چھ سو سال قبل بھی بودھ مذہب کی کتابوں سے ثابت ہوتا ہے کہ اُس زمانہ میں لوگوں کو باغوں کا بہت شوق تھا اور جب بودھ مذہب چین اور جاپان میں پھیلا تو یہاں بھی یہ شوق منتقل ہو گیا۔

ایران کے اندر یہ شوق اس سے بھی زیادہ قديم معلوم ہوتا ہے کیونکہ ساسانیوں کے زمانہ میں وہاں بڑے بڑے خوشنما باغ پائے جاتے تھے۔ اسی طرح آثار قدیمہ کی کھدائی سے یہ بات دریافت ہوئی ہے کہ زمانہ قديم میں بابل اپنے شگستانی باغوں کی وجہ سے خاص شہرت کا مالک تھا۔

ایرانی سلطنت کے باغوں کی خوبوں کا ذکر حضرت سلیمان نے زبور میں خوب کیا ہے، مثلاً وہ فرماتے ہیں "حصار سے گھرا ہوا باغ ہو، پہاڑ کے جھرنے کا پانی اُس باغ میں سے ہو کے بہ رہا ہو۔ اُس باغ میں خوشبودار طرح طرح کے درخت موجود ہوں اور باد صبا اس باغ کی خوشبو محل سرا کے اندر کسی معشوق کے دماغ تک پہنچ کر شاہ کے دل کی کیفیت اُس تک پہنچائے اسی طرح چاندنی رات میں تاروں کا جھلنا، چاند اور شمع ہائے کافوری کے عکس کا شفاف نہروں میں تھر تھرانا، گل و بلبل نظارہ۔ باد صبا کی مستانہ رفتار اور اس طرح کے بہت سے لطیف مناظر کا ذکر سلیمان نے اپنے باغ کے بیان میں کیا ہے۔

ایران کے اسلامی شعراء نے باغوں کی تعریف میں ہزار ہائے رنگ ڈالے ہیں، انگلستان کے سب سے قديم شاعر چاسر بھی دو برس قبل سعدی نے اپنی کتاب کا نام گلستان رکھا، اور حافظ نے بھی شیراز اور مشرقی ایران کے باغوں کی تعریف میں دقیقہ نہ اٹھا رکھا اسی طرح عمر خیام کا کلام باغ و ایوان کے ذکر سے لبریز ہے، خواجہ نظامی سمرقندی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "میر نے ایک دن فرمایا کہ اُن کی قبر ایسی جگہ ہوگی جہاں باد صبا اُن کی قبر پر پھولوں کے ڈھیر لگا دیا کرے گی، چنانچہ عرصہ دراز کے بعد جب میں اپنے استاد کی قبر پر نیشا پور گیا تو دیکھا کہ ایک باغ کی حصار کے باہر واقع ہے اور باغ کے درختوں کی ٹہریں ہوئی شاخیں مزار پر روزانہ پھول چڑھاتی رہتی ہیں۔" جس طرح جاپان میں پھولوں کی قدر ہوتی ہے بلکہ اسی طرح کسی وقت اصفہان میں بھی ہوتی تھی لیکن جاپان میں اس وقت تک فن باغبانی قائم رہ جانے کی وجہ یہ ہے کہ وہ بیرونی حملہ سے محفوظ رہا اور برخلاف اس۔ ایران ہمیشہ جنگ و حرب کا جولا لگا ہوا رہا اور اس لئے وہاں کے باغ بالکل ویران ہو گئے۔ مغلیہ زمانہ میں ایران ہی کے باغوں کے نمونے ہندوستان میں طیار ہوتے تھے اور وہیں کے عمارت کے نقشے یہاں بھی پیش نظر رہتے تھے، چنانچہ عمارتیں تو اب بھی وہیں ہیں مگر باغوں کا پتہ نہیں کیونکہ ہندوستان میں مغلیہ بادشاہوں کو بہت کم ایسا موقع ملا کہ ان کی جانب پوری توجہ کرتے۔ لڑائی جھگڑے کی وجہ سے ان کو اتنی فرصت نہ تھی اور کوئی ایک بادشاہ یا خاندان عرصہ تک سلطنت نہ کرنے پایا کہ وہ اپنے حوصہ پورے کرتا۔ فیروز شاہ تغلق کے زمانہ میں البتہ پای تخت دہلی کے چاروں طرف ایک سو باغ طیار کرائے گئے تھے جن میں سے ایک باغ بھی آج باقی نہیں ہے۔ ہاں چند بڑی نہریں جو اُن باغوں کو شاداب کرتی تھیں ان کے کچھ آثار ضرور نظر آتے ہیں۔ اس کے علاوہ

کے بعد بابر نے آگرہ کو فتح کر کے دریائے جمن کے ساحل پر رام باغ طیار کرایا۔

واقعہ یہ ہے کہ موسم بہار کی خوبی ایران کے مشرقی و مغربی ملکوں میں نظر آتی ہے، موسم گرما کی عمدہ مغلیہ کے باغوں کا انداز تازت اور موسم سرما کی خشکی درختوں کے پتوں کو خشک کر دیتی ہے اور سارے درخت عریان نظر آتے ہیں۔ مگر موسم بہار کی فیاضی اس برہنگی کی تلافی کر دیتی ہے اور چند ہفتوں کے اندر سال بھر کے پتوں درختوں میں نکل آتے ہیں اور سارا ملک اک موج گل ہو جاتا ہے۔

چونکہ سلاطین مغلیہ کا تمام ذوق ایران ہی کی آب و ہوا سے تعلق رکھتا تھا، اس لئے انھوں نے ہندوستان کو اپنے باغات سے ایران بنادینے کی کوشش کی اور یہاں کے موسم کی ناموزونی کا پورا مقابلہ کیا۔ یہاں یہ بات بھی ظاہر کر دینے کے قابل ہے کہ چونکہ سلام بت پرستی کا سخت مخالف ہے اس لئے مسلمانوں نے اپنی عمارت کی زیبائش میں کسی تصویر سے کام نہیں لیا، بلکہ صرف پھول و ٹولوں سے وہ خوشنمائی پیدا کی جو بڑی حد تک تصدیق کی کمی کو پورا کرتی تھی۔

ہندوستان میں سلاطین مغلیہ نے جو باغ کرائے وہ ایران کے نمونہ پر تھے، لیکن پہلے یہ سمجھ لینا چاہئے کہ ایران میں باغوں کی طیاری کا کیا دستور ہے۔ ایران کے باغ حتی الامکان دامن کوہ میں بنائے جاتے ہیں جمن کے سارے ایک جھیل ہوتی ہے اور محض باغ میں مناسب مقامات پر حوض اور فوارے ہوتے ہیں، باغ کے اندر نہر کے کنارے سرو کے درخت نصب کئے جاتے ہیں اور نہروں کی تہ آسمانی رنگ کی ہوتی ہے اور ان نہروں میں پانی ہر وقت بھرا رہتا ہے۔ باغ ایک مربع حلقہ میں بنایا جاتا ہے، بڑے باغوں میں چار دروازے بنائے جاتے ہیں اور چار گوشوں پر ہشت پہل مکان ہوتے ہیں، باغ کے اندر نہر کا پانی چاروں طرف کی طرح موقع بہ موقع گرایا جاتا ہے اور یہ چادر کا پانی ایک بڑے حوض میں جس میں کئی فوارے ہوتے ہیں اور مرغابیاں وغیرہ تیرتی رہتی ہیں، جمع ہوتا ہے، چونکہ ہندوستان اور ایران میں موسم گرما نہایت سخت ہوتا ہے اس لئے باغ کی خاص بارہ دری پانی کے اوپر تعمیر کرائی جاتی ہے تاکہ پانی کے گرنے کی خوشگوار آواز دوپہر کی دھوپ میں بند دروازے کے اندر بھی فرش سے آتی ہوئی محسوس ہو۔ اس بارہ دری کے چاروں طرف برآمدے ہوتے ہیں اور برآمدے کے باہر ہر طرف فوارے جاری رہتے ہیں تاکہ ان کے پانی کا چھینٹا برآمدہ کی ہوا کو ہر وقت ٹھنڈا رکھے، چونکہ بارہ دری کے اوپر سختانہ بھی ہوتے ہیں اس لئے دوپہر کی دھوپ اندر بہت کم محسوس ہوتی ہے چنانچہ شمالا مار باغ میں سیاہ سنگ مرمر کی بارہ دری اس کی شہادت میں پیش کی جاسکتی ہے، باغ کے اندر درخت بھی ایک خاص مناسبت سے لگائے جاتے ہیں۔ یعنی مربع تختوں پر، چہار دیواری کے کنارے کنارے دو روئے درختوں کی قطاریں ہوتی ہیں اور مربع زمین کے بیچ میں سے نہر نکالی جاتی ہے اور اس حصہ زمین پر پھولدار درخت نصب کئے جاتے ہیں، کبھی کبھی سرو کے درخت بھی باغ کی دیواروں کے نزدیک لگائے جاتے تھے اور گلاب کی جھاڑی یا انگور کی بیل بھی نہروں کے کنارے لگائی جاتی تھی جس سے لوگ دھوپ سے بچتے تھے، تمازت آفتاب سے بچنے کے لئے باغ میں آم یا چنار کے درخت بھی لگاتے تھے اور ان درختوں کے چاروں طرف ایک چبوترہ بنوا دیا جاتا تھا۔

بابر کے باغ شاہ بابر نے اپنے باغوں کا حال اپنی سوانح عمری میں بیان کیا ہے۔ کابل کے گرد و نواح میں اکثر فرحت افزا باغ تعمیر کرائے گئے، چنانچہ ان میں سے باغ و فابہت مشہور باغ تھا، یہ باغ حیدرآباد میں قلعہ ادنی پور کے مقابل طیار کرایا گیا تھا جس سال بابر نے لاہور فتح کیا، ہندوستان سے کیلے کے درخت طلب فرما کر لاہور کے باغ میں نصب کرائے، اور اس سے قبل وہ یہاں کا گنا بدخشاں اور بخارا میں لیجا چکا تھا۔ یہ باغ پہاڑ کے کچھ بلند حصہ پر لگایا گیا تھا اور اوپر سے کوہستانی چشمہ اس باغ کو نشاداب کرتا تھا، جنوب اور مغرب کے گوشہ میں ایک بہت بڑا حوض ۲۰ فٹ مربع طیار کرایا گیا جو ہر وقت پانی سے لبریز رہتا تھا، حوض کے ہر چہار جانب نارنج و انار کے درخت لگائے گئے تھے اور جا بجا لونگ کے درخت بھی تھے یہ مقام نہایت

برفنا تھا اور ان درختوں کے پھلنے اور پھولنے کے وقت اس کی رونق دوچند ہوتی تھی اس کے بائیں جنوب کوہ سفید واقع ہے۔ چہ
اکبر اعظم نے بابر نامہ کا ترجمہ ترکی زبان سے فارسی میں کرایا تو دربار کے مصوروں کے حکم ہوا کہ کتاب میں مناسب تصاویر بنائی جا
چنانچہ بشن واس ایک ہندو مصور نے تصویریں بنائیں اور مرزا عبدالرحیم نے بابر نامہ کا ترجمہ کیا۔ ایک تصویر کا منظر ہے کہ بابر خ
باش کے اندر درخت نصب کر رہا ہے کوہستانی چشمہ کا پانی پھولوں کے تختوں سے گزرتا ہوا حوض میں جا رہا ہے اور باغ کے دروازہ پر در
لوگ سلام کے منتظر ہیں۔ غالباً کوئی خبر جدید فتوحات کی لائے ہیں۔ مگر شہنشاہ اپنے مشغلہ میں اس قدر مصروف ہے کہ اس وقت سلطان
کے معاملات کو ملتوی کر دیا ہے، کیونکہ ہندو سال کے بعد شہنشاہ کو اس باغ میں صرف تین دن قیام کرنے کا موقع ملا ہے۔ اس
عرصہ میں وہ پورے جنہیں شہنشاہ نے اپنے ہاتھ سے لگائے تھے بڑے بڑے درخت ہو گئے ہیں۔ باغ کی شادابی کو دیکھ کر بادشاہ
کا دل باغ باغ ہو رہا ہے، چنانچہ وہ اپنی مسرت کا ذکر بابر نامہ میں اس طرح کرتا ہے "میں ایسے وقت باغ میں پہنچا کہ وہاں
پوری بہار پر تھا اور اس سے زیادہ خوشی اس باغ کے دیکھنے سے مجھے کبھی نہیں ہوئی" اس کے بعد موسم سرما میں لکھان کی
کوچ کرنا تھا اس لئے نارنگی کے ۲۰ درخت اپنے لئے مخصوص کر دئے۔ اسی کتاب کے ایک دوسرے نسخہ میں جو برکش میوزیم میں
موجود ہے ایک تصویر دکھائی ہے جس میں وہ گئے اور کیلے جو لاہور سے بحفاظت تمام لائے گئے تھے باغ میں لگے ہوئے نظر آتے
اور بیچ میں ایک پتیل کا حوض ہے جس میں سے پانی درختوں کو دیا جاتا ہے۔

برکش میوزیم سیاح کے شہنشاہ اورنگ زیب کے ہمراہ کشمیر گیا تھا، اس نے اپنے سفر نامہ میں ایک موقع کا ذکر کیا ہے کہ
شاہی پیش خیمہ کو مناسب مقام پر اونچی اور ناچھوار زمین پر ایستادہ کرتے تھے اور اس کے ہر چہار جانب تین تین سو قدم تک اور کو
خیمہ نہیں لگایا جاتا تھا، بہتر نفر مزدور صرف چوتھرہ کے طیار کرنے کے لئے کافی نہ ہوتے تھے اور شاہی خیمہ کے ہر چہار جانب قناطیر
کھینچ جاتی تھیں جو تاش بادلی کی ہوتی تھیں، قنات کے دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ ایک بارغ لگا ہوا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ مغلیہ بادشاہ حسن کے بڑے دلدادہ تھے۔ جس خوبصورتی اور مناسبت سے بارغ طیار کرتے جاتے تھے، اس
مناسبت سے نئے شہر آباد کئے جاتے تھے، بہرئے پڑاؤ پر خیموں کا ایک مختصر سا شہر نہایت خوبصورتی کے ساتھ طیار کیا جاتا تھا، تاکہ دیکھنے میں
بدنامہ معلوم ہو۔ افسوس ہے کہ ہندوستان اور کشمیر کے تمام مشہور باغات آج بری حالت میں پڑے ہوئے ہیں کہ انہیں دیکھ کر سخت
تکلیف ہوتی ہے۔ حالانکہ اٹلی کے باغوں کا نمونہ بالکل انہیں باغوں کا سا ہے اور ساری دنیا سے لوگ ملک اٹلی میں انہیں کی تصویر اٹار
اور سیر کرنے کو جاتے ہیں۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسے خوبصورت بارغ اب کیوں نہیں بنوائے جاتے؟۔ میری رائے میں اس
بے توجہی کے دو سبب ہیں۔ اول تو ہندوستانیوں کے عادات میں تغیر پیدا ہو جاتا کہ موسم گرما سرد پہاڑوں پر بسر کرنے کا رواج ہو گیا ہے۔ دوم
یہ کہ انگریزوں نے جس نمونے کے بارغ بنوائے شروع کئے وہ سلاطین مغلیہ کے باغوں سے بالکل مختلف تھے۔

اٹھارھویں صدی میں انگلستان کے باغوں کی یہ حالت تھی کہ نہ تو ان میں نہیں تھیں نہ خوشنما پھول کے درخت نہ نہروں پر پل جس
وہ نہایت بدنامہ معلوم ہوتے تھے، چنانچہ اسی ترکیب کی تقلید ہندوستان میں کی گئی، علاوہ اس کے وہ زمانہ بھی نہ رہا جب بادشاہ ہر سال
اپنی بیگمات کے ساتھ کشمیری باغوں کی سیر کو جاتے تھے اور امراء اپنی اپنی حیثیت کے مطابق دارالسلطنت میں شاندار محلات اور ان کے مناسب
باغات طیار کرتے تھے۔ برکش میوزیم اپنے سفر نامہ میں لکھتا ہے کہ "شہر دہلی میں ہزار ہا باغ اور محل لب جن واقع تھے، ہر بارغ و محل میں فوارے
ہر مکان میں تہ خانے ہوتے تھے جن کی خوشبو سے دماغ معطر ہو جاتا تھا، موسم گرما میں تمام محلات وسط باغ میں اونچی گرسی دیکر بنائے جاتے
تھے اور رات کو ان محلات کی چھت پر لوگ آرام و استراحت کرتے تھے، ہر کمرہ کے آگے، سائبان ہوتا تھا کہ اگر شبنم زیادہ پڑے تو سائبا
کے اندر چلے جائیں۔

آگرہ کے باغات۔ ہندوؤں کی قدیم مذہبی کتبوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ میرا پربت پر سب سے پہلے ہندوستان میں باغات لگے

کئے۔ باغ کا تذکرہ سرنگ کی قدیم مذہبی کتابوں میں پایا جاتا ہے۔ یہودیوں نے باغ عدن کا ذکر کیا ہے تو یونانیوں نے اعلیٰ پیمپس کا اور آتش پرتوں نے فردوس کا حال بیان کیا ہے، اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ بودھ کے زمانہ میں بھی ہندوستان کے اندر باغات موجود تھے، چنانچہ اب بھی ممبئی کے قریب لٹوئی میں اور پونا کے قریب کھنڈالا میں یہ باغات موجود ہیں مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ خوبصورت باغات آب و ہوا کی مناسبت کو مد نظر رکھ کر شاہان مغلیہ نے طیار کرائے اور ان کی خواتین نے بھی اس ذوق میں کافی حصہ لیا اور اس سلسلہ میں نور جہاں بیگم اور ارجمند بانو بیگم کا نام بہت نمایاں نظر آتا ہے۔

شاہان مغلیہ نے حسب تفصیل ذیل ہندوستان کے اندر باغ تعمیر کرائے:-

بابر - رام باغ، زہرہ باغ، آگرہ میں۔

ہمایوں - دہلی میں ایک باغ۔

اکبر - فتحپور سیکری، سکندرہ اور کشمیر میں نیم باغ۔

جہانگیر بادشاہ - لاہور میں شاہ درہ، نشاط باغ - شالامار - آج بھی بل باغ کشمیر میں۔

شاہجہاں - شالامار باغ دہلی میں، شالا باغ لاہور میں۔ باغات قلعہ دہلی - تاج محل کا روضہ آگڑ میں اور کشمیر میں دارا شکوہ کا باغ۔

اورنگ زیب - لاہور میں بادشاہی باغ اور چوہدری باغ دہلی میں، روشن آرا باغ، نیز دیگر باغات و دامن کوہ شملہ میں پنچور کا باغ۔

شاہان مغلیہ کے متبع میں ترکستان کے امراء نے بھی باغوں کی طرف توجہ کی، چنانچہ قفقاز، یارقند اور مشرقی ترکستان کے باغات بھی مشہور ہیں، یارقند کے باغ کا نام چینی باغ ہے۔ سمرقند کے باغ کا نام چہار باغ رکھا گیا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ بابر سے زیادہ باغوں اور پھولوں سے محبت کرنے والا بادشاہ کوئی نہیں گزرا۔ ہندوستان میں بابر کو تین باتوں کی سخت شکایت رہتی تھی، گرمی، گرد و غبار،

اور بادسوم کی چنانچہ ان سے محفوظ رہنے کے لئے باہر آئے آگرہ میں باغات بنوائے اور ہر باغ میں بڑی نہریں جاری کرائیں اور اس سے قبل ہندوستان میں جتنے باغات بنائے جاتے تھے وہ بے قطع اور بدنام ہوتے تھے، باغ کو خوش قطع بنانا ہندوستان نے مغلوں ہی سے سیکھا۔

مغلوں کو جہاں کہیں خوشنما مقام نظر آیا یا کوئی پہاڑ یا سنگستان چشمہ نظر آیا وہیں ایک باغ بنوایا، چنانچہ یہ لوگ پانی اور دامن کوہ کے بڑے شائق تھے اور ایسے مقامات تلاش کر کے باغ بنوادیے تھے، اس کے ثبوت میں کشمیر کا شالامار باغ پیش کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ آج بھی پانی ناگ، واہ، پنچور کے باغات اس کے شاہد ہیں۔ آگرہ میں البتہ کوئی پہاڑی ندی نہ ملنے سے گہرے کنوئیں کھدوانے پڑے اور دھوپ

کی تمازت روکنے کے لئے باغ میں بڑے بڑے درخت اعلیٰ کے لگائے اور عوض بنوائے، دریائے جمن کے بائیں ساحل پر رام باغ نور جہاں کی یادگار ہے جو نفاست مزاج کے لحاظ سے بہت مشہور فاقوں تھی، زہرہ باغ بابر کی شاہزادی زہرہ بیگم کا بنوایا ہوا ہے۔ اس باغ کے اندر

ساتھ کنوئیں درختوں کو سیراب کرنے کے لئے بنوائے گئے تھے اور سب سے بڑا محل اسی باغ میں تھا۔ آگرہ سے پانچ میل کے فاصلہ پر سکندرہ واقع ہے، یہاں اکبر کا مقبرہ ایک باغ کے اندر موجود ہے۔

ہر ترک باغ کا نقشہ پہاڑی باغات کا سا ہوا کرتا تھا، مثلاً ایک قطعہ زمین کو ہموار کر کے اور سیڑھی بنا کر دو سرا قطع زمین ہموار کرتے

تھے پھر اس طرح تیسرا قطع زمین ہموار کرتے تھے، یہاں تک کہ چھ سات قطع طیار ہو جاتے تھے، ہموار کی ہوئی زمین پر مربع روشیں بنوائی

جاتی تھیں اور باغ میں نارنج، ترنج، انار کے خوشبودار، خوشنما، خوش قطع درخت لگائے جاتے تھے اور باغ کے اندر سے ندی کا پانی

سب سے اوپر کے قطعہ زمین سے گرایا جاتا تھا اور ہر زمین کے اوپر بطور حاد کے یہ ندی بہہ کر نیچے جھیل میں مل جاتی تھی، جب بابر نے

آگرہ کو فتح کیا تو پہاڑی زمین نہ ہونے کی وجہ سے باغوں کی ترکیب کو بدلنا پڑا، اول تو سطح زمین پر چار مربع میدانوں میں باغ بنانا پڑا اور پھر

باغ کے چہار جانب بہت اونچی دیوار تعمیر کرائی گئی۔ باغ کو چار مربع حصوں میں تقسیم کر کے، وسط باغ میں بارہ دری اور اس بارہ دری

کے چہار جانب حوض طیار کرایا گیا تھا، جس سے چھوٹی نہروں کے ذریعہ سے باغ سیریا جاتا تھا۔ مگر چونکہ اکثر باغ مقبروں کے لئے طیار

کرائے گئے تھے، اس لئے وسط باغ میں بجائے بارہ دری کے مقبرے بنوائے گئے، اکبر اعظم کا مقبرہ جو سکندرہ میں واقع ہے ہندی اور اسلامی فن باغبانی کا مجموعہ ہے، اور آگرہ، دہلی، لاہور میں جا بجا بڑے بڑے مقبرہ شاہانِ مغلیہ اور مغلیہ خاندان کے امرا کے موجود ہیں اور شاہوں کی دیکھا دیکھی بیرونِ شہر بڑے بڑے باغات امرا لوگ طیار کراتے تھے اور بارہ دریوں میں بیٹھا کرتے تھے، مرنے کے بعد انھیں بارہ دریوں میں مدفون ہوتے تھے، اگر بادشاہ کو ایسے باغات کی ضرورت ہوتی تھی، تو کبھی کبھی جیب خاص سے خرید کیا جاتا تھا، جیسے بابر نے باغ کلاں کو خریدا تھا، یہ باغ مغل بیگ مرزا کی ملکیت تھی اس کے اندر سے ایک بڑی نہر جاری تھی، مگر ذرا بدنام طریقہ سے بنائی گئی تھی، باغ خریدنے کے بعد شہنشاہ بابر نے اس کو درست کرایا جس سے باغ کی رونق دو ہالا ہو گئی، اس باغ سے کوس ڈیڑھ کوس کے فاصلہ پر دامن کوہ میں ایک بڑا جھرنّا پانی کا ہے اور جس کا نام خواجہ سیاران تھا، اس حوض کے ہر چار جانب پتھر کی دیوار طیار کرائی اور حوض کو ایک بڑے چبوترے کے بیچ میں قائم کرایا، اس چبوترے پر بیٹھ کر پھولوں کے زمانہ میں ارغوانی تختہ کی بہار قابلِ دید ہوتی تھی زرد اور سرخ رنگ کے پھول بھی اس تختہ میں لگائے گئے تھے اور نہایت خوشنما معلوم ہوتے تھے، پشاور کے قریب بھی گلاب کی باڑیاں باغات میں لگوائی گئی تھیں۔ مگر موسمِ بہار کے بعد موسمِ گرما کے شروع ہوتے ہی یہ خوبصورت، سرخ، گلابی پھول مرجھا جاتے تھے۔ گویا بادِ سموم کی تیزی ان باغ کے چتر اُغول کو گل کر دیتی تھی۔

دریائے جموں کے پار جس سمت میں کہ رام باغ واقع ہے اُسی جانب عماد الدولہ کا باغ اور مقبرہ بھی واقع ہے یہ ایک چھوٹا سا باغ ہے مگر صنعت کے لحاظ سے یہ ایک ہیرہ کی انگوٹھی کے برابر قدر و منزلت رکھتا ہے اور ایوانی پچے کاری کا پہلا نمونہ ہندوستان میں ہے اس مقبرہ کو نور جہاں بیگم نے اپنے باپ مرزا غیاث بیگ کے لئے طیار کرایا تھا اعتماد الدولہ کا باغ بمقابلہ سکندرہ کے بہت ہی چھوٹا ہے اور اب تک شاداب ہے مگر تاہم نہروں میں پانی نہ ہونے سے اور درختوں کی کمی کی وجہ سے اس باغ کی اصلی خوبی جاتی رہی ہے۔

بارہ دری کے چبوترے کے ہر چار جانب چار حوض خشک پڑے ہیں اور دروازوں کے قریب کے فوارے بھی بالکل بے کار ہو گئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے جیسے نگینہ کو انگوٹھی سے علیحدہ کر لیا گیا ہو۔

تاجِ ارجمند بانو بیگم (ممتاز محل) کی خواہگاہ ہے۔ اس عمارت کے حالات میں اتنی کتابیں لکھی گئی ہیں کہ شاید کسی دوسری عمارت کو یہ فخر حاصل نہیں ہو سکتا۔ مگر اس میں جو دیکھنے کی بات ہے وہ صرف مقبرہ سے متعلق نہیں ہے بلکہ اُس کے گرد و نواح کے باغوں کی مناسبت ہے۔

جس کتاب سے میں نے یہ مضمون اخذ کیا ہے اس کی مصنفہ ایک جگہ لکھتی ہے کہ میں روضہ کی سیر کرنے چاندنی رات میں گئی اور صبح بھی یہ خوشنما منظر دیکھنے گئی، جاڑے کا موسم تھا پو پھٹ رہی تھی آفتاب کی رنگینی کا عکس سفید سنگ مرمر پر پڑ رہا تھا اور اس وقت کا ہر کون منظر عجیب کیفیت افزا تھا، جب میں اندر پہنچی تو روشنی آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی اور حوض میں روضہ کا عکس بھی اُبھرتا ہوا نظر آرہا تھا، سورج نکلنے نکلنے گنبد کے درختوں حصے نے سورج کی روشنی کو اپنے اندر جذب کر لیا، اور رفتہ رفتہ یہ گلابی رنگ گنبد کے چاروں طرف پھیل گیا۔ حتیٰ کہ ساری عمارت ایک گلابی آبدار موتی کی طرح دمک اُٹھی اور ایسا محسوس کرنے لگی کہ فردوس کا دروازہ ساکنانِ ارض کے لئے کھول دیا گیا ہے۔

اکثر لوگوں نے اس عمارت پر یہ اعتراض کیا ہے کہ اس میں زمانہ نزاکت بہت مر جود ہے، لیکن حقیقتاً اس عمارت کی خوبی یہی ہے کہ اس میں اس نزاکت کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ تاج ایک زمانہ نزاکت رکھنے والی عمارت ہے اور اس کے ہر ہر نقش سے نفاہیت ٹپکتی ہے، حتیٰ کہ اگر ہم چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ عمارت خود مجسم ممتاز محل ہے، جو صبحِ شام اور چاندنی رات میں باغ کے اونچے اونچے درختوں کی اوٹ سے جلوہ ریز ہوتی رہتی ہے، بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ یہ عمارت مشرقی خواتین کی اس فطری نزاکت و

پاکیزگی کی یادگار ہے جو کسی دوسرے ملک کی عورتوں میں نہیں پائی جاتی۔ اگر اس عمارت کا مقابلہ تھمر کے مصنوعی چیز سے کہا جاسکتا ہے تو وہ یونان کا مجسمہ وینس (زہرہ) ہے چوتھرے کے چاروں طرف کچھ فاصلہ پر بڑے بڑے آموں کے درخت لگائے گئے ہیں اور دوپہر کو اس عمارت کی چمک دمک دو بالا ہو جاتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آسمانی رنگ کے گہرے سمندر کی تہ میں کوئی موتی پڑا ہوا چمک رہا ہے۔

مصنفہ میں جب کرنیل آجمن نے ہندوستان کی پیمائش کی تھی تو اس باغ کا بھی ایک نقشہ کھینچا تھا، اُس وقت بھی یہ باغ اپنی اصلی حالت پر تھا، مگر اب اس کو بالکل انگریزی طرز پر بنایا گیا ہے جو روضہ کے لحاظ سے بالکل غیر مناسب ہے اس باغ کے نقشہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی ایرانی یا ترکی وضع پر بنوایا گیا ہے مگر صرف فرق یہ ہے کہ بجائے وسط باغ میں بارہ دری ہونے کے روضہ کو باغ کے آخری حصہ میں دریائے جمن کے کنارے بہت اونچے آثار کو قائم کیا ہے اور یہاں سے قلعہ بھی نظر آتا ہے، ممکن ہے کہ شاہجہاں نے روضہ کو باغ کے آخری حصہ میں صرف اس لئے بنوایا ہو کہ قلعہ سے صبح و شام اپنی محبوبہ بیگم کی خوابگاہ کی زیارت کر لیا کرے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ شاید دریائے جمن کے دوسرے ساحل پر شاہجہاں نے اپنے لئے دوسرا روضہ بنوانا چاہا ہو لیکن یہ خیال پورا نہ ہو سکا۔ برٹین نے شکالہ میں اس باغ کو دیکھ کر اپنے سفر نامہ میں اس کی بڑی تعریف لکھی، اس سیاح کے ساتھ چند اور فرانسیسی بھی موجود تھے اور بالاتفاق سب کے سب اس عمارت کی بابت یہ کہتے ہیں کہ سارے یورپ میں یہ ایسی عمارت کبھی بنائی گئی نہ ایسا باغ کبھی دیکھتے میں آیا۔

مصنفہ متواتر ایک مہینہ تک صبح و شام اس باغ کی سیر کو آئی کی۔ ایک دن جاڑے کی بارش میں سیر کو گئی، اس وقت کا حال بیان کرتی ہے کہ ہر درخت سے موتی ٹپکتا تھا اور بارش سے روضہ دھل کر بہت خوشنما ہو گیا تھا اور سنگ مرمر کے عکس پذیری کی یہ حالت تھی کہ ہلکے زرد رنگ سے لیکر گہرے سے گہرے رنگ کی چمک تک ان سفید تھمروں پر ظاہر ہوتی تھی اور وہ لکھتی ہے کہ دھوپ کی چمک میں تھمر کی نازک پچے کاری پر نظر نہیں ٹھہرتی تھی مگر اُس روز بادلوں نے دھوپ کو روک لیا تھا اور ان نازک پچے کاری کے کام کی خوبیاں بہت اچھی طرح نظر آ رہی ہیں۔ ہر طرح کے پھول نازک ڈالیوں پر کھلے ہوئے مقبرہ کے چار جانب دیواروں میں بنائے گئے ہیں کہ ان میں ہر ایک پھول ہندوستانی پھول کا نمونہ ہے، ان نقاشیوں میں ایک شخص کا نام (رام) کشمیری تھا اور ممکن ہے کہ اس کشمیری نے نور جہاں بیگم کے کشمیری باغ سے بھی سبق لیا ہو یہ امر بھی قابل غور ہے کہ جتنے بھی پھول بنائے گئے ہیں وہ سب کے سب موسم بہار کے پھول ہیں گویا اس محو خواب ملکہ کو پھولوں کی سچ پر ٹا دیا گیا ہے۔

برسات کے موسم میں بھی ایک دن یہ مصنفہ اس مشہور روضہ کی سیر کو گئی، چنانچہ وہ لکھتی ہے کہ ”یہاں نقاش نے نرگس کے پھولوں پر بہت توجہ صرف کی ہے، مقبرہ کے اوپر چمکی کاری کا کام ہے اور اس کے ہر چار جانب جو سنگ مرمر کی نقش چادر بنائی گئی ہے اُس میں بھی نرگس کے پھول دکھلائے گئے ہیں، آگرہ کے قلعہ میں بھی شہنشاہ بیگم کے حمام میں ایسی ہی نقاشی کی گئی ہے اور پانی کے لحاظ سے یہ رعایت رکھی ہے کہ کنول کے پھول کو ڈال سمیت پانی کے نلوں میں منقش کیا ہے۔“

شاہجہاں کے خیالات کی حقیقت دریافت کرنے کے لئے مصنفہ ایک دن دریا کے پار گئی اور وہاں سے اس نے روضہ کا نظارہ کیا۔ کہتی ہے کہ اُس جگہ سے اس عمارت کی پوری شان کا پتہ چلتا ہے، دریا کے اوپر ایک بہت بڑا چبوترہ اور چبوترہ کے ہر گوشہ پر گلابی رنگ کے خوش منظر مینار، دونوں مساجد، پھر روضہ کی بندی اور بڑی بڑی محرابیں اور پھولوں کے اوپر تاج کا گنبد، ان کا عکس دریائے جمن میں عجیب لطیف دیتا تھا، باغ کے بنانے کے لئے دوہی مناسب مقام ہو سکتے ہیں یا تو کسی پہاڑ کا دامن مثلاً کشمیر میں نشاط باغ یا دریا کا کنارہ جیسے آگرہ میں تاج گنج کا روضہ، یہ دونوں باغات اپنی مقامی حیثیت سے لا جواب طیار کر لئے گئے ہیں۔ تاج گنج کے چبوترہ

سے جہاں دونوں جانب ہشت پہل مینار کھڑے ہیں، دریا کی سیر نہایت پر عطف ہوتی ہے، ہر مندوستانی باغ میں کنارے پر ایسی ہشت پہل عمارتیں طیار کرائے کا دستور ہے اور گرمیوں میں چوتروں سے قلعہ کا نظارہ بہت اچھا معلوم ہوتا ہے، کہا جاتا ہے کہ شاہجہاں عہد آخر میں اسی قلعہ کے کسی برج یا بارہ درہی میں بیٹھ کر صبح و شام اپنی محبوبہ کی خواب گاہ کا نظارہ کیا کرتا تھا۔

انگوری باغ

قلعہ آگرہ کے اندر عہد مغلیہ میں دو بڑے باغ تھے، ایک کا نام مچھی بھون تھا اور دوسرے کا انگوری باغ۔ منوچی آٹلی کا مشہور سیاح بھی فرانسیسی سیاح برنیر کی طرح مغلیہ زمانہ کی شان و شوکت دیکھ گیا ہے وہ لکھتا ہے کہ دہلی - آگرہ - لاہور کے شاہی باغوں کے درمیان شاہی محلات تعمیر کرائے جاتے تھے، اور ان باغوں میں بڑی بڑی ہنریں ہوتی تھیں جن کے ذریعہ سے پانی سنگ مرمر یا زبرجد کے حوضوں میں جمع ہوتا تھا، اور محل کے تمام کمرے اور دالان سنگ مرمر یا زبرجد کے رنگ کی مناسبت سے تعمیر کرائے جاتے تھے، ان باغوں میں ہر موسم کے پھول ہمیشہ کھلے رہتے تھے اور چونکہ موسم گرما میں شام ہی کو باغ کی سیر ہو سکتی ہے، اس لئے چنبیلی - بیلا اور دوسرے سفیر رنگ کے خوشبودار پھول پرورش کئے جاتے تھے، محلوں کے اندر کے زمانہ باغوں میں بڑے درخت اس لئے نہیں لگائے جاتے تھے کہ دور کے نظارہ میں حرج نہ واقع ہو، اکثر محلوں میں بارہ دریاں بہتے ہوئے پانی کے اوپر بنوائی گئی تھیں جس میں رنگ برنگ کی مچھلیاں بھرا کرتی تھیں۔ جاٹوں نے مچھی بھون کا خاتمہ کر دیا اور زبرجد کے حوضوں کو توڑ کھینچ لیا مگر انگوری باغ کی قسمت اچھی تھی کہ بچے رہا۔ یہ باغ عین خاص محل کے مقابلہ میں واقع ہے اور اس کے سامنے تینوں طرف محراب وار راستے طیار کرائے گئے تھے، دراصل یہ خواتین شاہی کی سیر گاہ تھی، بیچ میں بارہ درہی قائم تھی اور چاروں طرف سیدھی روشنائی بنائی گئی تھیں جو ہر وقت پھولوں سے لبریز رہتی تھیں، بعض کا بیان ہے کہ شاہجہاں نے کاریوں کے اور گرد سنگ مرمر کی جعفری لگائی تھی اور اس پر انگوروں کی پل چڑھائی گئی تھی۔ بعض کا بیان ہے کہ اس باغ کی بارہ درہی میں جبرجی کاری کا کام ہے وہ انگوری طرح کا ہے، اس میں شہنشاہ نے اصلی رنگہ جڑواں تھے یعنی بجائے خوشہ ہائے انگور کے خوشہ ہائے مروارید لگائے تھے، قلعہ آگرہ کی بھی عجیب قسمت ہے کہ سیکڑوں بار اس کا محاصرہ ہوا ہزاروں مرتبہ اس کو لوٹا گیا، کبھی جاٹوں نے اس کو تباہ کیا، کبھی انگریزوں نے اسے سپاہیوں کے رہنے کے واسطے اس کو منتخب کیا لیکن حیرت ہے کہ اس زمانہ باغ کی جانب کسی کا خیال سبذ دل نہیں ہوا اور اسی وجہ سے یہ باغ بہت کچھ اپنی اصلی حالت پر برقرار ہے۔ انگریزوں نے اس قطعہ زمین میں ایک غرن ہوس طیار کرایا تھا، کمزور نے اس پر ناکہ فرن ہوس کو توڑ ڈالا۔

ہندوستان میں اب بھی ہاتھ کی بنی ہوئی چھوٹی چھوٹی تصویریں پائی جاتی ہیں جن سے ان باغوں کی صورتی و معنوی خوبیوں کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے ہر مغل خواہ وہ مصور ہو یا مہمارا۔ یہاں کے مطابق اپنی نقاشی میں فردوس کا منظر پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ باغ میں درختوں پر خوش رنگ چڑیوں کا اڑنا، رنگ برنگ پھولیوں کا لہروں میں تیزنا، پھولوں کا خوش قلعہ کاریوں میں کھلا ہوا ہونا ان تمام مناظر سے اصل مقصد یہ ہوتا کہ فردوس کا نقشہ پیش کر دیا جائے۔ چنانچہ ایک قسم کے ایرانی قالین کا نام فردوسی قالین ہے۔ اس قالین کی ساخت ایرانی فن باغبانی سے بہت کچھ ملتی جلتی ہے، اگر انگوری باغ کے نقشہ کو دیکھا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک بہت بڑا فردوسی قالین بچھا دیا گیا ہے۔

مغلی صنعت کے تمام شعبوں میں فردوس اور لوازم فردوس کا بہت زیادہ لحاظ رکھا گیا ہے۔ چونکہ مذہب اسلام میں جاندار کی تصویر کشی کو منع کیا گیا ہے اس لئے مستقیم و منحنی دوائر، اشکال مربع و مستطیل اور اقلیدس کی مختلف اشکال کے اختلاط سے ہزاروں طرح کی کاریاں کی جاتی ہیں اور پھول پتیوں سے اس کے حسن میں اور اضافہ ہو جاتا ہے، مثلاً انگوری باغ کے مقابلہ میں جو دیوان خاص بنوایا گیا ہے اس کے حصار کی دیوار کے حاشیہ پر جو کام ہے اس پر غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی بھاری دو شاہ کے حاشیہ کو کاٹ کر دیوار میں چسپاں کر دیا ہے اسی طرح کا

کام تاج کی دیواروں کے نیچے حصوں میں کیا گیا ہے۔

اگر کوئی شخص بنظر غور اس سچی کاری کو دیکھے گا تو اس سے ہندوستانی موسم بہار کے پھولوں کو پاؤں کا سوتی اور ریشمی کپڑوں کے حاشیہ زمین پر بھی، سونے چاندی کے زردوزی کام میں بھی، صنعت نظر آئے گی کا شمیری دو شاہوں میں بھی حاشیہ سوزن کاری ہوتی ہے، اس میں بھی باغ و متعلقات باغ ہی ظاہر کئے جاتے ہیں اور طعرہ غیرہ میں بھی آپ سی گل افشانی دیکھیں گے۔ مصوری میں بھی ہر جگہ یہ رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے، چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ جب کسی بادشاہ کی تصویر کھینچی گئی ہے، پس پشت ہمیشہ باغ دکھلایا گیا ہے مکانات کے فرش بھی اسی رعایت کے تحت طیار ہوتے تھے اور اس میں صحن باغ کے حوض کی کیفیت پیدا کی جاتی تھی، حتیٰ کہ دروازوں کے پردوں پر بھی لہریا لکیریں نظر آتی تھیں گویا دروازہ پر پردہ نہیں ہوتا تھا بلکہ پانی کی چادر گرتی ہوتی تھی۔

اوپر فردوسی قالین کا ذکر کیا گیا ہے، کہا جاتا ہے کہ یہ قالین شاہ عباس شہنشاہ ایران کے لئے طیار کرایا گیا تھا، یہ قالین بالکل ایک باغ کا نقشہ ہے۔ دو نہریں اس کے درمیان سیدھی آڑی جاری ہیں، نہروں میں پانی کی لہریں دکھلائی گئی ہیں۔ وسط میں ایک خوشنما حوض کا نقشہ دکھلایا گیا ہے اور نہروں کے کنارے پھولوں کی بڑی بڑی کاریاں ہیں اور ان بڑی کاریوں کو چھوٹے مربع قطعوں پر تقسیم کیا ہے اور ان میں آڑی سیدھی نہریں بنا کر درمیان میں حوض بنایا ہے۔ نہروں کے کنارے پھول کی کاریاں بنائی گئی ہیں اور اس قدر نازک صنعت و حیرت صرف کی گئی ہے کہ قالین پر سیر رکھتے ڈر معلوم ہوتا ہے کہ کہیں پھول نہ کچل جائیں اور اس قالین پر بھی تاج کی طرح زرگس، پدم، گلاب اور دیگر رنگین پھولوں کا انہار لگا دیا گیا ہے۔

اگر اس انگوری باغ کو بار دیگر اس کی اصلی حالت پر لایا جائے تو یقیناً ہندوستانی صنعت و حیرت کے مرجھائے ہوئے درخت میں جان ڈل دینا ہوگا، لیکن یہ آرزو بیکار ہے، اب وہ مذاق بدل گیا ہے اور حکومت ان فنون کو زندہ رکھنا اپنے فرایض میں شامل کر سکتی ہے۔

دنیا کا کوئی دار السلطنت دہلی سے زیادہ قدیم ہونے کا مدعی نہیں ہو سکتا، مہا بھارت کے وقت سے اب تک یہ شہر آباد ہے اور کہا جاتا ہے کہ ”پانڈو“ اور ”کورو“ کی لڑائی اسی کے قریب پانی پت میں ہوئی تھی۔

اس مقبرہ کے باغ کا رقبہ ۳۳ ایکڑ زمین بتایا جاتا ہے اور عہد مغلیہ کے ان باغوں میں اس کا شمار ہے جس کے اصلی ڈھانچے اپنی اصلی حالت پر قائم ہیں، حکومت برطانیہ نے یہاں کی نہروں اور فواروں کو درست کر دیا ہے مگر درخت نہ ہونے سے یہ باغ بالکل ویران معلوم ہوتا ہے اس باغ میں جا بجا نہریں بکثرت بنوائی گئی تھیں اور ہر چوراسے پر چھوٹے حوض بنوائے گئے تھے، ہندوستان میں بمقابلہ ایران و ترکستان کے نہروں کی ضرورت بہت کم ہے، دریا اور کنوئیں سے آب پاشی کا کام لیا جاتا ہے مگر مغلیہ باغات کی نہروں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ جب اول اول یہاں آئے تو ہندوستان کی شادابی سے واقف نہ تھے، اسی لئے ایرانی باغات کی تقلید میں چھوٹی چھوٹی نہریں آبپاشی کے لئے اپنے باغات میں طیار کرائیں۔

جب مغل بادشاہوں نے دہلی کو اپنا مستقل پایہ تخت بنایا تو یہاں کے موسم گہرا سے بچنے کے لئے باغات کی نہروں کو زیادہ چوڑا کر دیا اور حوض بھی بڑے بڑے بنوائے۔ اور ہندوستان کی آب و ہوا کے مطابق مکانات بنوانے پڑے، اگر آپ کسی پرانے مغلیہ باغ کی سیر کو تشریف لیجائیں تو اس میں آپ چھوٹی چھوٹی نہریں پائیں گے، گویا نہر کی تنگی باغ کی قدامت کا ثبوت ہے، اگر باغ بہت پرانا ہے (یعنی بابر اور ہمایوں کے زمانہ کا) تو نہریں چھوٹی اور تنگ ہوں گی، اگر باغ جہانگیر کے زمانہ کا بنا ہوا ہے مثلاً شالامار باغ تو یہ مصنوعی نہریں بہت چوڑی ہوں گی اور نہروں میں فوارے بھی ہوں گے۔

دہلی میں صفدر جنگ وزیر اودھ کا مقبرہ بھی باغ کے اندر واقع ہے، دو بڑی نہریں آڑی تر چھنی ہوئی ہیں اور ان کے کنارے چار مکان ہیں جن میں سے ایک پھانگ کا کام دیتا ہے، باقی

باغ نواب صفدر جنگ

تین بارہ دریاں ہیں۔ کسی زمانہ میں اس باغ، پھل کے درخت بہت تھے زمانہ کے انقلاب نے اس باغ کی اصلی صورت کو تبدیل کر دیا ہے، تاہم اب بھی سیر کے قابل ہے۔ ایک قابل غور بات ہے کہ وہ باغ جن میں کسی شاہزادہ یا امیر کا مقبرہ پایا جاتا ہو انقلاب زمانہ سے کم متاثر ہوئے ہیں، پورانے سیاحوں میں سے اکثر نے دہلی کے ایک اور شاہی باغ کا تذکرہ کیا ہے اور یہ وہ باغ ہے جس کو شاہجہاں کی بیگم اعز النساء اکبر آبادی نے طیار کرایا تھا، شاہجہاں نامہ میں محمد صالح مورخ نے لکھا ہے:-

”یہ باغ تین سو گز مربع زمین پر بنایا گیا تھا، اور اس باغ کے دو حصے کئے گئے تھے، اوپر کا حصہ نیچے کے حصہ سے نو فٹ کی بلندی پر تھا اور دونوں حصوں کا ایک مصنوعی نہر ۲۰ فٹ چوڑی بنوائی گئی تھی اور اس سے چھوٹی چھوٹی نہریں ساڑھے پانچ فٹ چوڑی مکان کے اندر نکالی گئی تھیں اور ان چھوٹی نہروں کا پانی بڑے بڑے حوضوں میں چادر کی طرح گرایا تھا، بڑے حوضوں میں متعدد گہرے بار بارے جاری تھے، باغ کے اونچے حصہ پر ایک حوض ۲۰ گز لاٹیا، اٹھارہ گز چوڑا طیار کرایا گیا تھا اور اس کے چاروں طرف نہایت خوبصورت بارہ دریاں قائم کی گئی تھیں۔ اسی باغ میں ایک اور مہشت پہل حوض تھا جس میں اکیس فوارے جاری تھے، اس حوض کا پانی باغ کے باہر ایک بڑے تالاب میں جا کر لہجاتا تھا، یہ تالاب دو سو چالیس گز لاٹیا اور ایک سو سات گز چوڑا تھا اس باغ کی تعمیر میں چار سال لگے تھے اور اس زمانہ کے حساب سے دو لاکھ روپیہ صرف ہوئے تھے، پچھی بھون کا باغ جسکی تقلید میں یہ باغ دہلی میں بنایا گیا تھا، کشمیر میں واقع ہے اور وہ خود آگرہ کے ایک باغ کی نقل میں طیار کرایا گیا تھا۔

دہلی کا شالامار باغ دہلی کا شالامار باغ شہر سے ۲ میل جانب شمال واقع تھا، برتھیر سیاح نے ۱۷۷۷ء میں اورنگ زیب کے شاہ عالم بادشاہ کے زمانہ میں ایک انگریزی سیاح لفٹنٹ فرانکلن نے اس باغ کا حال لکھا ہے کہ ”اس کی عمارت میں جو قیمتی پتھر لگے ہوئے تھے انھیں لوگ لے گئے، مگر حرم سرا کی دیواروں پر جو نقاشی کی گئی تھی وہ اپنے حال پر قائم ہے کیونکہ اس کا پلاستر سنگ مرمر کے چرنے کا نہایت مضبوط تھا، سنہ ۱۷۷۷ء میں یہ باغ انگریزی ریڈیٹ کے رہنے کے لئے دیا گیا تھا مگر اس کے بعد سے اس باغ کی حالت خراب ہوتی گئی حتیٰ کہ ۱۷۷۷ء میں یہ باغ بالکل ہی بگڑ گیا اور ۱۷۷۷ء کے اندر کے بعد یہ باغ ضبط ہو کر فروخت کر ڈالا گیا، موجودہ حالت اس باغ کی یہ ہے کہ آدھا حصہ کچھ باغ سا معلوم ہوتا ہے اور نصف حصہ میں کھیتی ہوتی ہے سنہ ۱۷۷۷ء میں آثار قدیمہ کا ایک افسر اپنی رپورٹ میں لکھتا ہے کہ سوچاں برس میں اس باغ کا نشان تک مٹ جاسکے گا۔

مبارک باغ شاہی زمانہ کا ایک اور باغ مبارک باغ تھا، اس باغ کو کسی مغلیہ بادشاہ نے اودھ کے کسی نواب کو اس شرط پر عطا فرمایا تھا کہ اس باغ سے روزانہ پھل پھول اور سبزی کی ڈالیاں محلات میں بھیجی جایا کریں، یہ باغ ابھی تک اسی خاندان میں چلا آتا ہے، لیکن اب نئی دہلی کے باغات کے لئے اس کو وقف کر دیا گیا ہے۔

باغ روشن آرا بیگم شہر سے قریب سبزی منڈی کے مغرب میں روشن آرا بیگم کا باغ ہے۔ روشن آرا بیگم نے اورنگ زیب کے زمانہ میں بڑا عروج حاصل کیا تھا، روشن آرا بیگم کا مقبرہ بہت بڑی سنگ مرمر کی بارہ دریا سے باغ کے اندر پایا جاتا ہے اس بارہ دریا سے باغ کے پھاٹک تک بہت بڑی نہر بنائی گئی ہے، جس کے ہر دو جانب پھولوں کے تختہ لگائے گئے ہیں اور جس میں بے شمار فوارے جاری ہوتے ہیں، اس نہر کا پانی اب تک جاری ہے، باغ کے دونوں جانب کی دیواریں گر گئی ہیں اور بڑے تالاب کے کنارے کی تین بارہ دریاں مسمار ہو گئی ہیں اور ہر چہار جانب گاڑیوں کے لئے سڑک نکالنے سے یہ باغ اور بھی بد نما ہو گیا ہے۔

باغ تال کٹورہ یہ باغ بھی دہلی میں جانب جنوب واقع ہے، اس باغ کی دیوار قائم ہے اور وسط دیوار کا پھاٹک اور کناروں

لیکن ٹوٹ گئی ہے، یہی حالت اس باغ کے حماموں کی ہے اب بھی کچھ نشانات اس باغ کی اصلی حالت کے موجود ہیں۔ اس باغ کو دو قطعوں پر تقسیم کیا ہے، اوپر کا حصہ حصہ زیریں سے ۲۰ فٹ اونچا ہے اور اس اونچے حصہ کے کنارے ایک جانب سے دوسری جانب تک چھوٹی منڈیر بنائی گئی ہے۔ اور منڈیر کے نیچے ٹہنے کے لئے ایک چوڑی سڑک ہے اور اس سڑک کے شروع اور اختتام پر مکانات بنوائے گئے ہیں اور ان مکانات کے قریب زمینہ واقع ہے جس پر چڑھکر باغ کے اوپر کے حصہ میں لوگ پہنچتے ہیں، یہ حصہ چالیس فٹ چوڑا ہے اور اس قطعہ زمین کے مابین ایک بہت بڑی عمارت بنوائی گئی ہے اور دونوں جانب گوشوں پر ہشت پہل عمارت ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ باغ شاہی بیگمات کے لئے طیار کرایا گیا تھا، اس باغ سے قلعہ کے برج نظر آتے ہیں۔ نواب صفدر جنگ اور ہمایوں کے مقبرہ کا نظارہ بھی ہو سکتا ہے، اس باغ کا تالاب بالکل سوکھ گیا ہے اور اب اس میں کچھ پانی ہی باغ کے باہر کے کنوئیں بھی جس سے کسی زمانہ میں پانی کھینچ کر باغ کو شاداب رکھتے تھے، سوکھ گئے ہیں، چونکہ اس باغ کے دو حصے تھے، لہذا قیاس کیا جاتا ہے کہ اوپر کے حصہ پر کسی موزوں مقام سے بہت بڑی پانی کی چادر نیچے کے بڑے نل میں گرائی جاتی ہوگی۔ باغ اپنی اُجڑی ہوئی حالت میں بھی اپنی گزشتہ بہار کا پتہ دیتا ہے۔

مصنف نے ایک قدیم تصویر اپنی کتاب میں دی ہے، جس میں اس عہد کے سقف باغ کا عکس کھینچا ہے، شام کا وقت ہو بلکہ یوں کہئے کہ چاندنی رات ہے، مکلف فرش پر شاہنشاہ سر پر آرا ہیں اور دو عورتیں شاہ کے سامنے مجرا کر رہی ہیں اور گرد نہایت قریب سے عواتین کھڑی ہیں، مردنگ اور ستار عورتوں کے ہاتھ میں ہے۔ شمع دانوں میں شمع کا فوری چاروں طرف روشن ہیں۔ شاہ کی تلوار کو ایک خواص لئے ہوئے قریب سے پیچھے کھڑی ہے اور دیگر خواصیں خوشبودار پھولوں کا مالا، پھولوں کی ڈالیا لئے ہوئے ہیں۔ درمیان میں ایک مربع قطعہ پھلواڑی کا اور بیچ میں فوارہ دکھایا ہے۔ اس چھوٹے باغ کی دوسری جانب ایک بارہ دری کے بیچ میں ایک چھوٹا تخت رکھا ہوا ہے بارہ دری میں تین محرابیں اور دو دروازے دکھلائے ہیں اور بارہ دری کی چھت کی منڈیر نقش سنگ مرمر کی ہے، ممکن ہے کہ تال کٹورہ کے باغ کو بھی ایسا ہی سقفی باغ بنایا ہو، کیونکہ ایک حصہ اس باغ کا دوسرے حصہ سے ۲۰ فٹ اونچا ہے۔

قلعہ دہلی کے باغات قلعہ آگرہ کے باغات سے بھی زیادہ بدتر حالت میں ہیں۔ حال ہی دہلی کے قلعہ کے باغات میں کچھ مرمت اس باغ کی کرائی گئی ہے جو بالکل ناکافی ہے، قلعہ کی مغربی دیوار اور باہر والے نل کے مابین کسی زمانہ میں ایک بہت بڑا مربع حصہ زمین کا باغ کی صورت میں تھا، محلات کے اندرونی کمروں میں جانے کے لئے دیوان عام کے اندرونی کمروں میں جانے کے لئے دیوان عام کے عقب میں بیگمات کے سیر و تفریح کے لئے کئی باغ طیار کرائے گئے تھے، برتیر نامی سیاح نے ایک وقت جب بادشاہ دہلی سے باہر مع محلات کے تشریف لے گئے تھے۔ قلعہ کے محاصرہ کے کمروں کو دیکھا، چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ ہر کمرہ کے سامنے فوارے جاری تھے اور چاروں طرف خوشبودار درخت سایہ کئے ہوئے تھے، نہریں بہ رہی تھیں، گرمی سے بچنے کے لئے بڑے بڑے پتے خانے بنوائے گئے تھے اور بالا خانوں پر رات کو چاندنی اور خشک ہوا عجب لطف دیتی تھی۔ یہ سیاح کہتا ہے کہ قلعہ کے اندر آتے ہی دھوپ کی تمازت جاتی رہتی تھی اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ کشمیر کے کسی خطہ میں بیٹھے ہوئے ہیں، علاوہ چھوٹے چھوٹے باغات کے دو بڑے باغ اس قلعہ میں بنوائے گئے تھے، جن کا نام حیات بخش باغ اور بہتاب باغ تھا، یہ دونوں باغ ایک ہی طرز پر جدا جدا طیار کرائے گئے تھے، ان میں سے ایک باغ پانچ سو فٹ مربع اور دوسرا باغ پانچ سو فٹ لائنا اور تین سو پچاس فٹ چوڑا تھا، بڑے باغ میں غسل کرنے کے لئے بہت بڑا تالاب بنوایا گیا تھا اور اس تالاب سے چاروں طرف نہروں میں پانی جاری ہوتا تھا۔ تالاب کے قریب ایک بارہ دری بنی ہوئی تھی اور برآمدوں میں ہر چہار جانب فوارے جاری تھے، اس تالاب کی دو نہریں دو عمارتوں کے جانب لے گئے ہیں ان کا نام سادون بھاؤ

تھا، جن میں سادون بھاؤوں کی برسات کا سماں دکھلایا ہے، قلعہ کی دیوار کے عقب میں ایک سڑک بنائی گئی ہے، اور اس سڑک کے پہلو میں پانی کا نئی جاری ہے اور نل میں ہر جگہ فوارے لگے ہوئے ہیں، جانب شمال شاہ برج واقع ہے، یہاں ایک نہایت خوبصورت سنگ مرمر کا حوض بنایا ہے، جہاں اب باغ بالکل ہی غائب ہو گیا ہے اور حیات بخش باغ کا آدھا حصہ خراب ہو گیا ہے اس باغ کے آخری حصوں میں سادون بھاؤوں کے مکانات کے عقب انگریزی سپاہیوں کے رہنے کے لئے بدناما بارکین بنوائی گئی ہیں۔ جہاں اب باغ کے سامنے جو سپاہیوں کی بارک بنوائی گئی ہے وہ باغ کی خوبی کے لئے سخت بدناما داغ ہے، قلعہ کے اندر باغوں کے درخت، ان کی روشیں اور سرو کی قطاریں سب غائب ہو گئی ہیں اور بجائے ان کے مورم کے راستے نظر آتے ہیں یا خالی گھاٹیں۔

لاہور کے باغ عہد جہانگیر و نور جہاں میں لاہور کو بھی اک خاص امتیاز حاصل تھا، نور جہاں اسی شہر سے ہر سال موسم گرما میں کشمیر کو جایا کرتی تھی، کیونکہ یہ شہر پہاڑی مقامات سے بہ نسبت اور شہروں کے قریب تر ہے۔ لاہور کا شاہی محل بھی قلعہ کے اندر واقع تھا اور دیگر شاہی محلات کی طرح باغات کے اندر بنوایا گیا تھا۔ شیش محل کے مقابلہ میں ایک بہت بڑا مربع قطعہ زمین واقع ہے اور اس کے ایک جانب نو لکھا بارہ دری اب تک موجود ہے، جس میں ایک پر تکلف فوارہ اور مقبرہ وجود رکھتا ہے آج کل اس قطعہ میں انگریزی فوج رہتی ہے اور یہ شاہی محلات بارکوں کا کام دے رہے ہیں۔

شاہدرہ یا دلکشا باغ شاہدرہ کا باغ رادی ندی کے دوسری جانب لاہور سے پانچ میل پر واقع ہے اس باغ کو نور جہاں بیگم نے تعمیر کرایا تھا اور اس کا نام ”دلکشا“ رکھا تھا، اس باغ کو جو سڑک گئی ہے وہ قلعہ کے قریب سے ہو کر اونگ تریب کی شاہی مسجد کے پاس سے گزرتی ہوئی نکلی ہے، کہا جاتا ہے کہ بڑی مسجدوں میں یہی ایک مسجد ایسی ہے جس کے صحن میں باغ لگا ہوا ہے، اسی دلکشا باغ میں جہانگیر دفن ہے۔ شاہدرہ باغ میں ایک بڑے پھاٹک سے ہو کر آنا پڑتا ہے، اس پھاٹک سے ہو کر آنا پڑتا ہے، اس پھاٹک کے اوپر نہایت خوشنما عمارت بنی ہوئی ہے، باغ میں آتے ہی ایک بہت بڑا قطعہ زمین نظر آتا ہے اور فصیل کی دیواروں پر چاروں طرف ایک مسقف غلام گردش بنی ہوئی ہے، شاہی باڈی گارڈ کے سپاہیوں اور خدام سلطنت کے قیام کے واسطے مخصوص تھے، جب بادشاہ وہاں نہ ہوتے تھے تو کابل کی جانب سے آنے والے اسی سڑک پر ہو کر گزرتے ہیں اور رات کو اسی باغ میں ہو کر قیام کرتے تھے، مسافروں اور فقرا کے لئے یہ باغ ہمیشہ کھلا رہتا تھا، یہ مقبرہ اعتماد الدولہ کے مقبرہ کے نقشہ پر بنوایا گیا ہے، مگر وسعت میں اس سے کہیں زیادہ ہے، اس مقبرہ کا باغ سکندرہ کے باغ کے نقشہ پر بنایا گیا ہے، مقبرہ آٹھ بلند چوڑے کے درمیان واقع ہے اور ان میں سے ہر چوتھرہ کے بیچ میں ایک حوض ہے اور ہر حوض میں فوارے جاری ہیں، اور باغ کی ہر سکندرہ کی نہر سے چوڑی ہے، اب بھی جب کبھی یہاں کے فوارے جاری ہوتے ہیں تو صدر دروازہ سے جس کی اونچائی پچاس فٹ کی ہے، نظارہ نہایت خوشنما معلوم ہوتا ہے۔ باغ کی حالت نہایت خراب ہے اور صحن بالکل اُجڑا پڑا ہے، سڑکوں کے دونوں جانب درختوں کے نہ ہونے سے جن کے نیچے کسی زمانہ میں مسافر آرام لیتے تھے نہایت بدنامی پیدا ہو گئی ہے۔

باغوں کے نصب کرنے میں زیادہ احتیاط یہ رکھنی چاہئے کہ ہر چیز ایک ہی طرح کی ہو کہ نہ ہو کیونکہ اگر باغ میں رنگ برنگ کے درخت یا پھول موجود نہ ہوں تو باغ کی خوبی جاتی رہتی، اسی اصول پر شاہان مغلیہ نے اپنے باغوں کو چار حصوں پر تقسیم کیا ہے گویا ایک باغ میں چار رنگ اور چار طرح کے باغ موجود ہوتے تھے، اور ان میں سے ہر ایک باغ کی شان جدا جدا ہوتی تھی، کبھی ایسا بھی کیا جاتا تھا کہ اسی باغ کے ایک حصہ میں لالہ زار کی دمک نظر آتی تھی، دوسرے حصہ میں گلاب کی جھاڑیوں سے رونق بڑھائی جاتی تھی، سلاطین مغلیہ نہ صرف باغ بنانے میں کیتا تھے بلکہ خوبصورت نقاشی بھی انھیں کا حصہ تھا، لاہور میں اب بھی وزیر خاں کا مقبرہ موجود ہے اور نقاشی کے کام کے لحاظ سے بے نظیر ہے۔

زیبا النساء بیگم کا چوہدر جا باغ بھی بہت خراب حالت میں پڑا ہوا ہے اس کے چار حصاروں میں سے اب صرف ایک حصار موجود ہے

صدر دروازہ البتہ دیکھنے کے قابل ہے اس پر نہایت اعلیٰ درجہ کی بچی کاری کام کیا ہے۔ اس باغ کو زیب النساء بیگم نے کسی کو انعام میں دیدیا تھا اور اپنے لئے ایک دوسرا باغ وہاں سے کچھ آگے فواکوٹ میں طیار کرایا تھا، جہاں وہ مدفون ہیں۔

شاہجہاں نے بھی جہانگیر کے کشمیری باغ کے نمونے پر شالامار باغ لاہور میں تعمیر کرایا تھا۔ شالامار میں اس باغ کی تعمیر کا کام علی مردان خاں نامی مشہور کاریگر اور انجینئر کی نگرانی میں شروع ہوا۔ یہ وہی مشہور انجینئر ہے جس نے دہلی کی نہر تعمیر کرائی تھی، کہتے ہیں کہ اس شخص نے ہندوستان میں چنار کے درختوں کو پھیلایا، ایک زمانہ میں یہ گورنر کشمیر بھی رہ چکا تھا، لاہور کا باغ تین حصوں پر منقسم ہے اور مجموعی طور پر ۵۲۰ گز لانا اور ۲۳۰ گز چوڑا ہے، کسی زمانہ میں اس باغ کے باہر بھی باغات تھے، باغ کے ہر سہ جانب بارہ دریاں ہیں اور بیچ میں ایک چبوترہ ہے جس پر لوگ ایک پل پر سے ہو کر گزرتے ہیں۔ یہ چبوترہ اتنا بڑا ہے کہ باوجود اس میں ایک بڑا حوض ہونے کے اوپر بھی پھولوں کی کیاریاں لگی ہوئی ہیں، یہ کیاریاں ہشت پہل ہیں، بیچ بیچ میں مستطیل کیاریاں بھی ہیں انہیں کیاریوں کے اندر پھول اور سرو کے درخت لگائے جاتے تھے، مگر اس طور پر کہ ایک جانب اگر ہشت پہل ستارہ نما کیاری کے اہم درخت پھول کا ہوتا تو اس کے دوسری جانب دوسرے طرف کی کیاری میں سرو کا درخت نصب کیا جاتا اور یوں ہی ہر کیاری کے جواب میں درختوں کا رد و بدل دکھاتے۔ گاہے گاہے دو نارنج کے درختوں کے درمیان بھی سرو کا درخت نصب کیا جاتا۔

راجپوتانہ میں بھی سلطنت مغلیہ کا بہت بڑا اثر پڑا ہے، شہنشاہ جہانگیر نے اپنی جوانی میں تخت نشینی سے قبل اودے پور میں کئی باغ طیار کرائے اور یہ پہلا موقع تھا کہ راجپوتانہ میں ایسے خوبصورت باغ بنوائے گئے ہوں۔ یہ باغ ایرانی قالینوں کے نقشہ پر طیار کرائے گئے تھے، باغ کے بیچ میں بیٹھنے کے لئے چبوترے بنائے گئے ہیں اور چبوترے کے ہر چہار جانب جھیل کا پانی بھرا ہوا ہے اس چبوترہ پر خوش الحان معنی بیٹھ کر گایا کرتے تھے، باغ کے چاروں طرف بارہ دری ہے اور باغ کے ہر گوشہ پر ٹہنے کے لئے سنگ مرمر کے اونچے چبوترے بنے ہیں اور چبوترے کے عقب میں بڑے بڑے درختوں کی قطار سایہ کے لئے لگائی گئی ہے، یہ باغ بہت خوش قطع ہے اور ایک بڑے تالاب کو گھیر کر اس کے بیچ میں کہیں کہیں مٹی ڈال کر زمین اونچی کی گئی ہے اور یہ ابھرے ہوئے جزیرے بالکل ایرانی قالینوں کے نمونے پر بنوائے گئے ہیں۔ یہاں ایک زمانہ باغ بھی ہے اس کے بیچ میں ایک بہت بڑا زینہ دار تالاب واقع ہے اور اس کے چاروں طرف چھوٹے چھوٹے مربعوں پر درخت لگائے گئے ہیں اور ہر مربع کے چاروں طرف سرو کے درخت نصب کئے ہیں اور ان کے درمیان جالدار سنگ مرمر کی چھوٹی چھوٹی دیواریں ہیں اور بیچ میں سڑک بنائی گئی ہے، تالاب کے گرد جو سڑک ہے اس میں آکر چھوٹی چھوٹی سڑکیں مل گئی ہیں۔ انہیں مغلیہ باغات کے پتھروں کو اکٹھا کر اٹھارھویں صدی میں سکھوں نے امرتسر میں رام باغ طیار کرایا تھا۔

شالامار باغ کے بالائی طبقہ میں بڑے حوض کے دوسرے جانب ایک بہت بڑی بارہ دری بنی ہوئی ہے اس کے نیچے سے ہو کر پانی بہتا ہے اسی نہر کے اوپر ایک نہایت خوبصورت چبوترہ یا سنگ مرمر کا تخت بادشاہ کی تفریح کے لئے بنوایا گیا تھا، اس تخت کے ہر چاروں طرف دو دو فٹ اونچی سنگ مرمر کی دیوار بنی ہوئی ہے، شاہجہاں اکثر اوقات اسی تخت پر بیٹھ کر باغ اور فواروں کا نظارہ کیا کرتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس باغ کے بڑے تالاب میں ایک سو چالیس فوارے جاری تھے جو پدم کے پھول کی طرح تھے، اسی باغ میں مشرق کی جانب درمیانی حوض کے مقابلہ میں شاہی حمام بنا ہوا ہے۔ اوپر بیان کیا گیا ہے کہ شالامار باغ کئی طبقوں میں بنوایا گیا تھا، چنانچہ زیریں طبقہ سڑک کے صدر پر واقع ہے اس سے اوپر کا طبقہ باغ خاص میں شمار کیا جاتا تھا اور سب سے اوپر کا طبقہ جو باغ کا قیصر اور سب سے اونچا حصہ تھا وہ زمانہ محلات کے لئے مخصوص تھا، اس باغ کا پچھاٹک نہایت خوشنما بچی کاری کے کام کا ہے اور صدر دروازہ جانب مغرب واقع ہے، مغلیہ باغات میں زمانہ محلات کا پورا لحاظ رکھا جاتا تھا، شاہجہاں کے زمانہ میں ایک کتاب لکھی گئی تھی جس کا نام "بادشاہ نامہ" ہے اس کتاب میں منجملہ دیگر باغات کے شالامار باغ کا بھی تذکرہ ہے۔

ایک پروفیسر

ایران کی جدید شاعری اور امن و صلح کا موضوع

انسان پر شاید ہی کوئی ایسا زمانہ آیا ہو جب اُس کو جنگ کی تباہیوں کا سامنا کرنا پڑا ہو۔ لیکن ازمہ قدیم کی جنگوں کی تباہ کاریاں اُن دو جنگوں کے سامنے ہیچ ہیں جو خود ہمارے زمانہ میں لڑی گئی ہیں اور جن کے اثرات سے دنیا ہنوز خراب حاصل نہیں کر سکی۔ پچھلی عالمگیر جنگوں کی بربادیوں کا باعث وہ آلات حرب اور اسلحہ جات جنگ ہیں جنہیں انسان اپنے علم و حکمت کی مدد سے ایجاد کیا ہے۔ اس حقیقت پر ایران کے ایک شاعر عطا گیلانی نے اپنی نظم ”جنگ بین الممالی“ میں بڑا چبھتا مواظنر کیا ہے:-

نتیجہ نظر فیلسوف و عقلی حکیم کہ عہدہ دار بود اجتماع دنیا را
ہمیں بود کہ کمرہ اختراع آلاتے کہ خوش ز عہدہ بر آید قائے اشیا را
کسی در اینجا اگر اختراع تازہ کند بغیرت آرد سودا ئیان آئینہ را
کہ اختراع ازاں بہ کنند و بستاند بجز کشتن خلق امتیاز اصلی را

ساری دنیا پچھلی عالمگیر جنگوں کی ہولناکیوں کو یاد کر کے لرزہ بر اندام ہے اور اس بات کی خواہشمند ہے کہ دنیا میں اب جنگ نہ ہو۔ انسانیت کو اپنے عروج تک پہنچنے کا موقع میسر ہو۔ چنانچہ پہلی جنگ عظیم کے بعد بھی جنگ روکنے اور امن کے تحفظ کے لئے مختلف تجویزیں غور و فکر اور عمل میں آئیں جن میں سے تخفیف اسلحہ کی تحریک اور لیگ آف نیشنز کا قیام قابل ذکر ہے لیکن تخفیف اسلحہ کی تحریک محض تجویز کی منزل سے آگے نہ بڑھ سکی۔ عطا گیلانی نے اپنی ایک دوسری نظم میں جو مذکورہ صدر نظم سے پہلے لکھی گئی تھی، اس مسئلہ پر یوں اظہار خیال کیا تھا:-

حوزہائی اجتماعی چیست ؟ قانون فساد جیلہائی دیپلوماسی چیست ؟ قانون دول
قصہ ترک سلاح ، آنگاہ تشہیر سلاح کنگرہ صلح و صفا ، آنگاہ آغاز جدل

دوسری جنگ عظیم کے بعد دنیا میں امن قائم رکھنے کے لئے از سر نو کوششیں شروع ہوئیں اور اسی غرض سے انجمن اقوام متحدہ وجود میں آئی۔ پولینڈ کے مقام ’روکلا‘ میں ۱۹۴۵ء میں مجتمع ہو کر قیام امن کی جدوجہد کے لئے عہد و پیمان کیا۔ سناہ کی جیتانے اس تحریک کا خیر مقدم کیا اور تمام دنیا کے عوامی ذکاروں نے امن و صلح کو اپنی زندگی کا مشن قرار دیا۔ دنیا کے مختلف ممالک میں اس تحریک کو آگے بڑھانے کے لئے امن کانفرنسیں ہوتی رہی ہیں۔ لیکن اب تک کوئی نتیجہ نہ نکلا۔

ایران کو گزشتہ دو عظیم جنگوں میں اپنے محل وقوع کی اہمیت اور تیل کے گراں بہا چشموں کی بدولت بڑی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران میں بھی وہ برطانیہ اور روس کی باہمی رقابت کی آماجگاہ بنا رہا۔ دوسری جنگ کے زمانہ میں ان دونوں طاقتوں نے اُس کی خود مختاری اور آزادی کا احترام کئے بغیر اُس کے مواضعات پر قبضہ کر لیا۔

ایران پر ان غیر ملکی اثرات کا رد عمل شدید جذبہ وطنیت اور زبردست احساس قومیت کی شکل میں نمودار ہوا۔ اور ایرانی شاعروں نے اس نازک دور میں اپنی قوم کی بڑی رہنمائی کی۔ انھوں نے اپنی ہوجان انگریز نظموں کے ذریعہ سے عوام میں احساس قومیت کو تیز کیا اور اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ غیر ملکی غاصبوں سے اپنے وطن کو نجات دلا دیں۔ چنانچہ پور داؤد کی

بعض نظمیں اسی ہنگامی جذبے کی ترجمان ہیں۔ رستخیز، یللی اور اندرز تینوں رجز کے انداز میں لکھی گئی ہیں۔ رستخیز کے دو بند ملاحظہ ہوں :-

تاروس ہلک جاگزیند تاجند بگلستان نشیند ،
تا دشمن کیفرش نہ بیند خود شہد بکام با شترنگ است
برخیز ز خواب وقت تنگ است
بشتاب کہ روز رزم و جنگ است
از بہر وطن بجاں بکوشیم در رزم بسان پیل جوشیم
چوں شیر و رزم بہم خروشیم گو دشمن اژدرو پتنگ است
برخیز ز خواب وقت تنگ است
بشتاب کہ روز رزم و جنگ است

وحید دستگردی نے بھی ایک مجلس میں اسی جوش و خروش کے ساتھ تمام اسلامی دنیا کو مخاطب کیا ہے اور انہیں غیرت و لاکر عرصہ کارزار میں اتر آنے کی ترغیب دی ہے :-

ہاں ای ملت اسلام! تہ آسانی چند جمع گردید، گرفتار پریشانی چند
نامتاں لگے تاریخ مسلمانانہ چند بستہ در سلسلہ روس و بریطانی چند
روز تعبیل جنگ است نہ ہنگام درنگ
تیغ وحدت بکشید، ای ملل اسلامی ز آب خون بشوئید لگہ بدنامی ،
ام اسلام نمایند کبیتی سامی و اندر پس بازی جان بازی و خول آشامی
بات سازید شہر کفر بہ قطع شترنگ

دوسری طرف وہ شعراء بھی تھے جنہوں نے جذبات کو قابو میں رکھ کر جنگ سے بیزارى ظاہر کی اور لعنت و ملامت کی اس سلسلہ میں عطا گیلانی اور بانو پروین اعتصامی کے اشعار پیش کئے جاسکتے ہیں۔ سمیع عطا گیلانی کا تعلق حزب دیموکراٹک سے رہا ہے اور اسی سیاسی عقیدے کے سبب اُسے جنگ اول کے زمانہ میں وطن سے ہجرت کر کے غیر ملکوں میں پناہ لینا پڑی تھی۔ اُس نے اپنے قصیدے ”جنگ بین المللی“ میں یورپی ممبروں اور سائنسدانوں پر زبردست لعن و طعن کیا ہے۔ آلات حرب کے موجدوں پر جن اشعار میں اُس نے طنز کیا ہے وہ پہلے نقل ہو چکے ہیں۔ جنگ کا سبب بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ چند بوڑھے سیاستدانوں کی رقابت نے ساری دنیا کو زیر و زبر کر رکھا ہے :-

رقابت دوسہ تن پیر سا خوردہ فگند بخون و خاک جوانان سرو بالا را
تو گوئی از پی اعظام ناتواناں داد خدا بچند نفس بازوی توانا را

جنگ نے عوام الناس میں کیا تباہی پھیلانی ہے، اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے عطا کہتا ہے کہ کسی گھر میں کوئی عورت یا لڑکا ایسی نہیں بچی ہے جس نے جنگ میں ہلاک ہونے والے اپنے عزیز رشتہ داروں کے غم میں ماتمی لباس نہ پہن رکھا ہو۔ بیچ خانہ زن و دختری نماند بجائی نکرده نیلی بر تن پرند و دیبا را
آخر کے وہ تین شعروں میں بڑے موثر انداز میں جنگ کو ختم کرنے اور دنیا میں امن قائم کرنے کی اپیل کرتا ہے :-
بس است ایں ہمہ غوریزی و جہالتگیری نشانند باید این جنگ بے محابا را

سزد کہ بردِ رقصا بخاندۂ بشری
بنا لہائی جگر سوز بیکسانِ رجمی
پردیسِ اعتصامی کی نظم ”تمنائی شاعر“ ملاحظہ ہو :-

زیند قفل و بیایان برید غوغا را
که خسته دارد دهائی ناشکیبا را

چه خوش بود ایں جنگ و دعوی نمی شد
میان سلاطین مشهور دنیا
خوش آن روز بائی که بودیم راحت
چه خوش بود ایر و پلان دست دست
جهازات جنگی باں شوخ و شنگی

بردی زمیں شور و غوغا نمی شد
چنین دشمنی پائی بے جا نمی شد
سخن از فرنگ و اروپائی نمی شد
بسوی هوا عرش پیا نمی شد
ز ببار ماں غرق دریا نمی شد

محمد بہایوں کر مافی کی دو نظمیں ”چشم انداز جنگ“ (جنگ کے مناظر) اور ”پیام صلح“ دوسری عالمگیر جنگ سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہیں۔ پہلی نظم میں اُن تباہیوں اور پریشانیوں کا تذکرہ ہے جو جنگ کے دیوتا نے دنیا پر مسلط کر رکھا ہے۔

رفت بر باد همه بود و نبود،
هر کرا میج نبود اکنون نیست
دشته ها گشته پُر از گشته و خون
همه جا بر سر آفتاب
هر چه را می نگری خونین است

سوخت یکسر همه سرمایه و سود
و انکه را بود کنون شد نابود
شهر باگشته پراز آتش و دود
نه حباب است کله باشد و خود
خاک خونین و افق خون آلود

صدیوں کے امن و سکون سے انسان جتنی ترقیاں کرتا ہے، جنگ اُن سب کو ملیا میٹ کر دیتی ہے :-

آنچی بخشید تمدن صد سال
اس نظم کے دو بند ہیں ہر بند کے آخر میں شاعر صلیح

چونکہ جنگ آید یکبارہ رہود

مبتلائی خفقان است جہاں
فرخ آندم کہ سروش ایزد

ای خوش آں لحظه که یابد پیبود
بندگان را دهد از صلح درود

کاشکی لطف خدا یار شود
چهره صلاح یار شود

دوسری نظم 'پیام صلح' میں شاعر یہ پیغام دیتا ہے کہ مصائب دنیاوی کا حل محبت و صلح میں ہے۔ شاعر جنگ کے ہولناک مناظر کو تصور کر کے اندیشہ مند ہوتا ہے۔ اسی فکر و اندیشہ کے عالم میں وہ خیالی طور پر ایک حسین اور پرمسرت دنیا میں پہنچ جاتا ہے جہاں وہ علمائے زمانہ، جنگ آوران دہر، ظالمان دنیا، قاضیان عہد، انشا پر دازان عالم اور دہقان روئے زمین کو اپنے لا حاصل کار ناموں پر متاسف پاتا ہے۔ یک بیک اُس پر راز حیات منکشف ہوتا ہے۔

گفتند آشکار بمن راز زندگی،
کای شاعر بلند نظر، راه عشق پوی
عشق خدا حقیقت رخشان زندگی است
آگاه به روی که ازین شاه راه رفت
روشن بود که نیست بجز قلب تابناک

آنها که رفت آمده و بر شادیم فرد
تا دانی اینکه بود چه می باشد و نبود
زنگ است هر گیتی و باید ز دل زدود
فرخنده آن سری که بر آن آستانه سود
آن ارمغان که نزد خدای است با نمود

اس حقیقت کو غریبوں کا خون چوس چوس کر عیش و عشرت کی متوالے کس طرح اپنی تباہی کا سامان طیار کر رہا ہے، ہمایوں کرانی نے ایک بڑی نادر تشبیہ کے ذریعہ بیان کیا ہے :-

کز برگ تودہ باست نوای شنگراں
روزِی رسد کہ دام شنگسراں شود

چونانکہ قوت کرم بر شیم ز برگ تود

ایں پیلہ ہا کہ از ستمش ہست تار و پود

لیکن اس وقت تک امن و سلامتی کا مفہوم بہت زیادہ واضح نہیں تھا۔ ایرانی شعرا اپنے انفرادی خیالات کا اظہار نظم میں کرتے تھے۔ اس موضوع کو اپنی شاعری کا مستقل مقصد نہیں بنایا تھا۔ 'روکلا' کی امن کا نفرنس کے بعد جب صلیح کی تمنا ایک عالمی تحریک کی شکل میں نمودار ہوئی تو ایران کے ترقی پسند شعرا نے بھی اس آواز کی حمایت کی۔ یہاں بھی صلیح پسند ادیبوں کی ایک امن کا نفرنس ہوئی۔ جس میں ملک الشعراء بہار مرحوم نے ایک لمبی نظم بعنوان 'جغد جنگ' پڑھ کر سنائی یہ چکامہ عہد غزنوی کے مشہور شاعر استاد منوچہری دامغانی کی تتبع میں لکھا گیا ہے، نظم بڑی پر جوش ہے اور اشعار کی روانی اور خیالات کے بہاؤ کے باعث اس میں بڑا زور پیدا ہو گیا ہے۔ نظم کی ابتدا جنگ کے نام لعنت و ملامت کے ساتھ ہوتی ہے۔

فناں ز جغد جنگ و مرغوائی او

کہ تا ابد بریدہ باد نائی او

بریدہ باد نائی او و تا ابد

زمن بریدہ کرد آشنائی من

بہار جنگ کی ہولناکیوں کا تذکرہ کر کے اس کے خلاف دلوں میں نفرت و غم کے جذبات اُبھارتا ہے :-

ذراں زماں کہ نائی حرب درود

جہاں شود چو آسیا و دمہدم

رونہ تانگ بچو کوہ آتشیں

ہی خزد چو اژدہا و در چکر

چو پر بگستر و عقاب آہنیں

برزنگہ خدای جنگ، بگذرد

.....

بہر زمین کہ بگذرد بگستر

الا عذر ز جنگ و جنگبارگی

آخر میں بہار نے صلیح کی تعریف و توصیف کی ہے :-

کجاست روزگار صلیح و ایمنی ؟

کجاست عہد راستی و مردمی ؟

کجاست دور یاری و برابری

زہی کبوتر سپید آشتی

رسید وقت آنکہ جغد جنگ را

.....

شگفتہ مرزو باغ و دلکشائی او

فروغ عشق و تابش و ضیائی او

حیات جاودانی و صفائی او

کہ دل برد سرود جانفرائی او

جدا کنند سر بہ پیش پای او

خانم شہناز اعلامی ایران خدیوہ کی عوامی شاعرہ ہے۔ اس کی زندگی کا نصب العین عوام الناس کی خدمت رہا ہے۔ علی سرگزینیوں کی وجہ سے اسے قید و بند کی تکلیفیں بھی برداشت کرنی پڑی ہیں۔ اعلامی نے صلیح کی حمایت میں دو بڑی موثر

نظمیں لکھی ہیں۔ ”آپہ صلح“ (صلح کی دیوی) اور ”صلح بخاطر انسان ہا“ ”آپہ صلح“ ایک تمثیل کے پیرایہ میں جنگ کی لعنتوں کو نمایاں کر کے صلح کی ضرورت پر زور دیتی ہے۔ یہ نظم بڑی دلکش اور اُس سچی ہمدردی کی منظر ہے جو مظلوم انسانوں کی مصیبتوں پر شاعرہ کے دل میں پیدا ہوتی ہے۔ ایک معشوقہ اپنے عاشق کو یہ پیغام دیتی ہے کہ میں تم سے اس وقت شادی کروں گی جب تم دنیا میں صلح و آشتی کے قیام و تحفظ کے لئے جدوجہد میں کامیابی کے ساتھ حصہ لو گے۔ جب تک دنیا میں جنگ کا نام و نشاں باقی رہے گا اُس وقت تک ہماری زندگی حقیقی مسرت و شادمانی سے نا آشنا رہے گی۔ بہ قرار و دلفکار عاشق صلح کی دیوی کو ڈھونڈنے لگتا ہے۔ تلاش و تجسس کے بعد وہ اسی دیوی کا تاباں و درخشاں چہرہ ہر و محبت کی ایک بلند وارفیع چوٹی پر چمکتا ہوا دیکھتا ہے۔ جہاں

ایستادہ بہ نگہداری اد
مردمی پاک دل و باایمان
مادران کو دک شیریں درہر
پسراں خرم و زیبا و جوان
برزگر باہنگی دانش بکف
کارگر باہمہ باپتک گراں
دختران عاطفہ نوریں عشق
بسر دست گرفتہ خنداں
ہمہ آمادہ کہ درمہم صلح
جاں نمایند بشادی تریاں

دوسری طرف اُسے دنیا کے مردود و نامقبول اور ضمیر فروش سپاہیوں کی ایک مختصر سی فوج دکھائی دیتی ہے جس کا سیلا جنگ آد مخوار امن کے سکون پرور اور راحت بخش مسکن کو تاخت و تاراج کر دینے کے لئے فرمان صادر کرتا ہے۔ شاعرہ جنگ کے نعرے اور امن کے نغمہ کو کوریا کے میدان میں گونجتا ہوا بیان کرتی ہے:-

نغمہ صلح ہی آند و جنگ
نعرہ می زد ز غضب چوں طوفاں
تاخت بر کشور آرام کرہ
کشور زندہ دل جاویداں
ہرچہ زیبائی و امید و حیات
دید با خاک نمودش یکساں

اس کے بعد شاعرہ ایک بہت ہی دلگداز اور دردناک منظر کی تصویر کھینچتی ہے۔ جس سے جنگ کے دیوتا کے مکرو چہرہ کے خلاف دل میں شدید نفرت کا جذبہ بیدار ہوتا ہے:-

بمب ہر فائدہ مادر افگندہ
بدہاں داشت چو کودک پستان
کودک بی خبر از زشتی جنگ
ہرچہ نوشید ازاں مایہ جاں
دید شہیدی نتر اود بدہاں
دیر از شیر نماندہ است اثر
در عوض مایع سرخ و لہر جی
داشت از سینہ مادر جریاں
تشنہ لب بود و بنوشید بذوق
خوں جاری شدہ از آل شریاں

عاشق دل باختہ اس منظر سے بہت متاثر ہوتا ہے اور وہ کمر بستہ ہو کر قیام امن کے لئے سعی کرنے لگتا ہے یہاں تک کہ وہ اپنی گزشتہ کوتاہیوں کی تلافی پر بھی مستعد ہو جاتا ہے۔ اُس کی سعی و عمل سے جنگ کی قوتیں آہستہ آہستہ پسپا ہونے لگی ہیں، یہاں تک کہ اُن کا آخری مورچہ بھی متزلزل ہو جاتا ہے۔ تب عاشق اپنی معشوقہ کو شاداں و فرحاں کامیابی کا مرزدہ سنا رہا ہے اور اس حقیقت کا اظہار کرتا ہے کہ:-

خوب دانستہ ام اکنون تا صلح
بال نکشاید بہ فرق جہان
عشق بازی ہو سی پست بود
کہ نہ شایستہ بود بر انشاں

اعلامی کی دوسری نظم ”صلح بخاطر انسانہا“ کا انداز بیان زیادہ پر روشنی اور واضح ہے۔ اس میں شاعر نے صلح کے مفہوم اور مقصد کو بڑے خلوص اور تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے:-

بخاطر دل پُر تہریاں مادران جہاں
بخاطر دل مشتاق آرزو پرور
بخاطر چمن سبز شادی د امید
بخاطر تو کہ خواندی سرود آزادی
بخاطر تو کہ در پشت سنگر خونین
بخاطر تو کہ در بند دشمن بد خو
بخاطر تو کہ در بند دشمن بد خو
برای ساختن اجتماع نو بنیاد
برای عاشق و آزادہ اسی و بالا پر
دلیر و سرکش و آزادہ اسی و بالا پر
برای عاشق و آزادہ اسی و بالا پر

بیای صلح نشانیم شادمانی خویش
فدا کنیم دریں راہ زندگانی خویش

یعنی صلح دنیا بھر کی ماؤں، عاشقوں اور محنت کش کسانوں کے لئے ہے، آزادی کے اُن ہواخوں کے لئے ہے جنہوں نے پھانسی کے تختوں پر اور غوٹیں مورچوں کے پیچھے ہنس ہنس کے جان دی ہے۔ صلح ایک نئے معاشرہ اور ایک ترقی یافتہ زندگی کے لئے ہے۔

اس نظم کے آخری بند میں اعلامی دکھایا، کے آفت رسیدوں کے نام قسم کھا کر عام لوگوں کی طرف سے عہد کرتی ہے کہ وہ اپنی جان کو آئندہ جنگوں میں فضول ضایع نہ کریں گے اور صلح کو جنگ پر قربان نہ ہونے دیں گے۔

قسم بنالہ تبدیل گشتہ بر خریاد
ز خلق مادر آزاد تہرمان 'کرہ'
بمادر سپیدہ دی شدہ اعدام
نوشته با خط جاوید جاں نشان 'کرہ'
قسم بکودک مادری کہ سرگرداں،
بماندہ زندہ در انبوه گشتگان 'کرہ'
قسم بعاشق دلخستہ اسی کہ معشوقش
فقادہ در صفت اجساد نیمہ جان 'کرہ'

برایگان نفرو شیم جان دینا را

باہرین نسپاریم صلح زیبا را

”کوریاء“ کی جنگ اُس وقت چھڑی ہے جب عالمی امن کی تحریک شروع ہو چکی تھی۔ یہ واقعہ طالبان صلح کے لئے بڑا دشوار تھا۔ لیکن اس نازک وقت میں امن کے علم برداروں نے اپنے نصب العین سے انحراف نہیں کیا اور کوشش کی کہ سامراجی طاقتوں نے جدال و قتال کی جو آگ کوریاء میں بھڑکائی ہے وہ اُسی سرزمین تک محدود رہے اس تحریک کے سلسلہ میں خلیل آسایش کی نظم ”سرباز صلح“ بڑی اہم ہے۔ یہ نظم تکنیک کے لحاظ سے منفرد قسم کی اور شاعر کے عمیق احساس کی پیداوار ہے۔ اس میں بھی ایک دردناک اور الم انگیز تصویر کے ذریعہ جنگ کی تباہ کاری اور ہولناکی کو بیان کیا ہے۔

ایک رات جبکہ آسمان پر گہرے سیاہ ابر چھائے ہوئے ہیں، دشمن کے بمبار طیارے ایک دیہات پر بموں کی بارش کرتے ہیں جس سے سارا دیہات برباد ہو جاتا ہے، سب عمارتیں کھنڈر ہو جاتی ہیں۔ ایک لڑکا اُسی رات شہر سے اُسی دیہات میں اپنے گھر آتا ہے۔ وہ دیہات کو تاریکی میں ملفوف مکانوں کو منہدم اور شکستہ اور اُن کی کھڑکیوں سے دھواں نکلتا ہوا دیکھ کر بے حد پریشان ہوتا ہے۔

جہیست کا بنیساں جہم جاتا تاریک است اور من کہ نمی خواہد زود

کوی بہرچہ شدہ ساکت و تار
من کہ رفتم کہ چنین تیرہ نبود،
خاٹہ ہا ! اودہ چرا گشتہ چنین
در اہم و سو خستہ و دود آلود
خاٹہ ماکو ؟ ۔۔۔۔۔ ایوانی کجاست
کہ چنین می زند از پنجرہ دود

وہ لڑکا ترساں و ہراساں، مہبوت و حیراں، جلدی جلدی اپنے مکان کو ڈھونڈنے لگتا ہے۔ اس کا دل شکوک و شبہات سے بھر جاتا ہے۔ وہ نالہ و فریاد کرتا اپنے لوگوں کو پکارتا جاتا ہے۔ لیکن اُسے کہیں سے کوئی جواب نہیں ملتا۔ اس کا پاؤں قدم قدم پر اکڑی ہوئی ٹھنڈی لاشوں سے ٹکراتا ہے۔ وہ گھبرا گھبرا کر ادھر ادھر دوڑتا اور ہر مردہ کو اٹھا اٹھا کر دیکھتا ہے کہ کہیں میرے ہی ماں باپ تو نہیں ہیں۔

خوردشس ناگہ چیز ی برپای
این دگر چسیت خدایا۔۔۔ طفلیست!
جامہ اش فہس و منش یخ کردہ
خفتہ ؟ این سردی و خاموشی چسیت ؟
ہوی۔۔۔ بر خیز بہیم۔۔۔ مردہ است
ندہد پاسخ، این دیگر کیست۔۔۔
کودک مردہ بود خواہر او،
پسرک را خبر از خواہر نیست

اس قسم کی بھیاںک مگر واضح تصویر کسی دوسری نظم میں مشکل سے ملے گی۔ آخر کار وہ لڑکا ایک شکستہ محراب کے پیچھے اپنے باپ کی اور ایک پتھر کے نیچے ماں کی لاش دیکھتا ہے۔ باپ کے چہرے پر قسم ہے، گویا وہ اس بات پر خوش ہو رہا ہو کہ ”میرے بیٹے تم اس کڑی کے نیچے دب جانے سے بچ گئے“ ماں کا چہرہ غمزہ ہے، اس کی کھلی ہوئی آنکھوں کے گرد خون کا ایک بالہ سا بن گیا ہے، گویا وہ زبانِ حال سے کہہ رہی ہو:-

پسرم بہرچہ کرد اینساں دیر ؟

ناگہاں وہ ماں کی خیالی آواز کو پکارتی ہوئی سنتا ہے اور وہ اس آواز سے ہمکلام ہوتا ہے:-

آہ فرزند تو زخمی نشدی ؟۔۔۔۔۔
شکر۔۔۔ پس خصم بتو حملہ نہرد۔۔۔۔۔
چسیت مادر ؟ پدرم پس کیجاست۔۔۔۔۔
زیر آں طاق گمانم شدہ خورد۔۔۔۔۔
خواہرم کو ؟۔۔۔۔۔ بنشین طفلک من
جنگ چوں رفت در با خود بُرد۔۔۔۔۔

لڑکا بے تاب و بے قرار ہو کر ماں کی لاش کو اٹھا کر سینہ سے چٹا لیتا ہے۔ اس کے بعد سین بدل جاتا ہے۔ بچی کی چوک بس وہی لڑکا کو ہستانی علاقے کے نشیب و فراز کو طے کرتا ہوا جاتا دکھائی دیتا ہے۔ اُس کے پاؤں میں باپ کا خون آلود بوٹ اور کانٹے پر ایک پرانی بندوق ہے۔ اُس کے دماغ میں ایک ہیجان برپا ہے، مگر چہرے پر ایک خاص آب و تاب ہے اور آنکھیں لالہ گوں ہو رہی ہیں۔ وہ اُن سپاہیوں میں جا کر مل جاتا ہے جنہوں نے صلح کو فتح مند بنانے اور دنیا کو جنگ کی تلخی سے نجات دلانے کا عزم بالجزم کر لیا ہے:-

پای در چمکہ خونین پدر،
بر سردوش کی کہنہ تفنگ

میرود در رہ پیروزی صلح
تا نگردد بجہاں شہد شریک

سید عبدالعلی پر تو علوی کی نظم ”چکا مہ صلح“ قصیدے کے طرز پر لکھی گئی ہے۔ اس میں صلح کی تعریف و توصیف ہے اور اس کی برکات و فوائد کی توضیح کی گئی ہے۔ دنیا کی آسودگی صلح و سلامتی ہی میں پوشیدہ ہے۔

در کار صلح کوشش کہ آسودگی خلق،
باشد کمینہ نعمت خوان عطای صلح
”در کار خیر حاجت میچ استخارہ نیست“
”الصلح خیر کو بد دائم در ای صلح“

بار درخت صلح بجز عدل و امن نیست خوش بخت ملتی کہ خورد میوه ہای صلح
صلح و صلاح و سلم و صفا آورد پدید آن بانگ آشنا کہ بر آید ز نای صلح
شاعر نے اس الزام کا جواب دیا ہے کہ صلح کی تحریک کسی بیرونی ملک کے اشارے پر چلائی جاتی ہے :-
گفتا مرا کسی کہ زیگان لگاں بود ، این نای آشنا کہ نواز د نواہی صلح
آری بدست ہمت مردان صلح جوی باید برید برتن عالم قباہی صلح
پرتو کا خیال ہے کہ مغرب نے اگر امن قائم کرنے میں تعاون کیا تو ساری دنیا کو فائدہ پہونچے گا :-
خورشید معدلت دمد از خاوران امن گمر باختر پہونید راہ رضای صلح
صلح کے طلبگار صلح اس لئے چاہتے ہیں کہ آئندہ نسلیں شادمانی و کامرانی کے ساتھ زندگی بسر کر سکیں :-
شادی و کامرانی آئندگان بود ، جوہندگان صلح جہاں را جزای صلح
انسانیت کی بقا جنگ کی فنا میں مضمر ہے :-

باشد بقای نوع بشر در فتنای جنگ باشد فتنای فتنہ و شر در بقای صلح
صلح کی صحیح قدر و قیمت اُن ہی کو معلوم ہے جنہوں نے گذشتہ جنگوں میں نقصان برداشت کیا ہے :-
قدرو بہای صلح چہ داند کسیکہ او آسودہ متکی سر شدہ بر متکائی صلح
ز اں داغدیدہ مادر فرزند کشتہ پرس با تو عرضہ دارد قدر و بہای صلح
مجرور تیر خوردہ نو مید از حیات گیرد حیات خویش از سر بانڈای صلح
واں دید طفل بیگنہ خویش غرق خوں در چشم او نیر زد عالم بجای صلح

ابو تراب جلی و ز فولی کی نظم ”جنگ“ اگرچہ اُن سب نظموں کی بہ نسبت جن کا حوالہ قبل دیا گیا ہے، مختصر ہے مگر بہت خلوص اور جوش کے ساتھ لکھی گئی ہے۔ شاعر نے اس نظم میں بڑا کامیاب تکنیک اختیار کیا ہے، جنگ کی گھناونی صورت اور بد باطن سیرت کا نقشہ سامنے آ جاتا ہے۔ اُس نے ”جنگ“ کو ایک ”گرگ خیرہ سر“ کی شکل میں پیش کر کے اُس کے چند ایسے سوالات کئے ہیں جن سے زبردست لعنت و ملامت ظاہر ہوتی ہے :-

چہ دلی داری ایسے درندہ شوم کہ ز کشتار خلق سروری
فخیم صلحی و دشمن عدلی عاشق ظلم و تابع زوری
بر آید ز پردہ شاہد امن تا تو در پشت پردہ سروری

چوں تو آئی، شود ز پردہ بروں

نالہ و اشک و آہ و آتش و خوں

می بری لذت از چہ، از خوئی، کہ بریزد ز جسم بیگنہی ؟
از بد نہای سر و خوں آلود، چیدہ پہلوی ہم بقتلگی ؟
از صدای فغان مجروحی، کہ بلند است و رشب سہی ؟

یا ازاں خانہ ہای ویرانہ

یا ز غوغای صاحب خانہ ؟

می کنی خندہ بر چہ ؟ بر آہی ؟ کہ کشد مادری، پسر مردہ ؟

برنسیم مصیبتی کہ از آن ، شدہ باغ حیات پڑ مردہ ؟
بر امید کی کہ دست ناکامی ریشہ اش کندہ از میان برودہ

یا بر آن اشکبای حسرت و تپیم
کہ فرود ریزد از دو چشم تپیم ؟

آخر میں شاعر اس منحوس درندے کو دنیا سے دور نکال دینا چاہتا ہے اور کہتا ہے کہ اس کے دانت اور چنگل میں پہلی سی
پہری اور پیش باقی نہ رہی۔ کیونکہ تمام دنیا صلح کا نعرہ بلند کر رہی۔ جنگ بازوں کی عیاریاں اب عوام کو گمراہ کر کے جنگ میں
نہیں بھٹسا سکیں گی۔

دور ! اسی گرگ خیرہ سر کہ ترا دگر آن نیش و جنگ و دندان نیست
بانگ صلحی است اینکہ بر گردوں میرود ، بانگ گو سفندان نیست
کرہ خاک ، در فضای وجود گوی چو گان آزمندان نیست
چشم برہم گزار و یادہ گوی

توتیای زگرد گلہ مجوی

شریف الدین شرف خراسانی کی نظم ”غول جنگ“ میں جنگ و امن کے متعلق عام خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ اس میں
جنگ اور جنگ کے پرستاروں کی سخت بھوک کی گئی ہے اور آخر میں مجاہدین امن کی ہمت بڑھاتے ہوئے امریکہ کے سابق صدر ٹرومین
کو صاف صاف لفظوں میں جنگ بازی سے الگ رہنے کی ہدایت کی گئی ہے۔

گو بزد آہنیں ! آن قہراں سلم و صلح تا تو ہستی کس نہ بیند چرخ غول آسای جنگ
ایں توفی پیوستہ بینی ہر شبی رویای صلح گرچہ بیند خضم خلق رنجبر رویای جنگ
عالمی را بانگ استیلای صلح آید گوش با تروماں ، گو مشو مفتون استیلای جنگ

محمد صالح وکیل صالح کی نظم ”ندائی صلح“ کو ریا کے اُن مجاہدین کے نام پیغام ہے جو تحفظ امن اور قیام صلح کی جدوجہد میں
پیش پیش ہیں۔ اس نظم میں شاعر کا اشتراکی لب و لہجہ بہت نمایاں ہے۔ برطانوی اور امریکی سیاست دانوں کے حق میں تلخ و
تندیاتیں کہی گئی ہیں۔ شمالی اٹلانٹک کے عہد نامہ کی زبردست بھوک کی گئی ہے اور اس کے پیچھے جو سامراجی مقاصد پنہاں ہیں
اُن کو بے نقاب کیا گیا ہے۔

بجای ثراین و ایتالیا و آلمانند فراتک و انگلو آمریک قائم محور
بعہد نامہ ننگیں اطلسی شمال فکندہ اند جہاں را سپر نگاہ خطہ
بنام اصل ”ترومن“ بتودہ ہا می فقیر دہند توپ و تفنگ و گلولہ و اثر در
زہر حفظ ظلم و کاخ ہای رفیع نہ بہر تودہ ہندی و شامی مضطر
زہر پائیکہ بر علیہ جبر صلح نہ بہر شفقت و احسان ہزار عین ستر

مغربی سیاست دانوں کو جنہیں ”رہزناں دریائی“ کے نام سے یاد کیا گیا ہے لعنت و ملامت کرنے کے بعد ”اشاکیم کانفرنس“
کی جس میں ایٹم بم کے استعمال پر پابندی لگانے کے لئے متحدہ تحریک چلانے کی اپیل کی گئی تھی تحریف کی گئی ہے اور اسے ”وال اسٹریٹ“
کی حکمت عملی کا توڑ بتایا گیا ہے۔

نسیم صلح وزید از دیار اشکبلم ، ہرادیانی ”وال اسٹریٹ“ را کیفر

چھ کیفری کہ بلبر زائد پشت آمریکا گزاشت در رہ قصاب جنگ سد و پیر
بعد ازاں شاعر کو ریا کے شجاع مبارزوں کو براہ راست مخاطب کر کے انھیں امن و آزادی کی جدوجہد میں اور آگے بڑھنے
کی ترغیب دلاتا ہے اور انھیں ساری دنیا کے نجات دہندہ کی حیثیت سے ناموری حاصل کرنے کی تحریص کرتا ہے:-

بہ پیش تاکہ زمین برکنید استعمار شوید عبرت و نیامی خسرو و قیصر
بہ پیش تاکہ یہ پیروزی نہائی خویش رسید و کسب کنید افتخار نام آور
غلام رضا مرزاد نے اپنی مختصر سی نظم "سرباز صلح و آزادی" میں امن و سلامتی کے مفہوم کو ماقبل کی نظم کی بہ نسبت
زیادہ صحیح و معقول طریقے پر وسیع الخیالی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ امن کی تحریک کسی خاص سیاسی نقطہ فکر یا کسی مخصوص
گروہ بشر کے ساتھ وابستہ نہیں ہے۔ اور نہ امن کسی خاص خطہ دنیا ہی کے لئے مطلوب ہے:-

سرباز راہ صلح و آزادی من دشمن ستگری و جنگم
من دوستدار دیار بشر ہستم من پاسدار دانش و فرہنگم
ہر جا کہ آدمی است مرا آغیا ما دای و مسکن است و وطن باشد
من سبز و سرخ و زرد، منی دامن انسان بہر کجا است، زمین باشد
امن کے مطلب اور اس کے وسیلے کو واضح کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے:-

سرباز صلح ہستم و جنگ من جنگی است عادلانہ، علیہ جنگ
جنگ میان دانش و نادانی جنگی نفع جامعہ و فرہنگ
جدید ایران کی مذکورہ بالا چند نظموں کے تجزیہ سے یہ پتہ چل جاتا ہے کہ ایران کے عوام میں صلح و امن کی کس قدر زبردست
خواہش ہے اور ایران کے ترقی پسند شعرا اس معاملے میں ان کی رہنمائی کر کے اپنا فرض کس طور پر پورا کر رہے ہیں۔ لیکن موجودہ
ایران اس وقت شدید سیاسی بحران میں مبتلا ہے۔ معلوم نہیں عالیہ آشوب و ہنگامہ اور گیر و دار میں صلح و آزادی کے پیغام رسا کو
اور امن و سلامتی کے پرچم برداروں پر کیا ہوتی۔
(پروفیسر) سید حسن (پٹنہ کالج)

شہوانیات

اور

شہاب کی سرگزشت

(رعایتی قیمت اخیر اپریل ۱۹۵۷ء تک)

ان دونوں کتابوں کی قیمت معہ محصول معیہ ہے، لیکن دونوں
ایک ساتھ طلب کرنے پر معہ محصول چھپ میں مل سکتی ہیں۔

من ویزداں (کامل)

کا

دوسرا ڈیشن

(رعایتی قیمت اخیر اپریل ۱۹۵۷ء تک)

اس کی قیمت معہ محصول نو روپیہ ہے، لیکن خریدان نگار
اسے معہ محصول صرف سات روپیہ میں حاصل کر سکتے ہیں۔

منیجر نگار لکھنؤ

جنت سے نکل کر

(۱)

زندگولا کی موت سے کسی کو رنج ہوا ہو یا نہ ہوا ہو لیکن ملازم علی کی اس لطیف آبادی میں جسے ”خوروں“ کی دنیا کہتے ہیں یقیناً زبردست تہلکہ مچ گیا۔

یہ اپنے قصبہ کا بڑا دیندار، متقی اور شب زندہ دار انسان تھا، لیکن قسمتی سے اس نے صورت ایسی مکروہ پائی تھی کہ مشکل ہی سے کسی کا دل اس کی طرف کھینچ سکتا تھا۔ عنفوان شباب میں اس نے شادی بھی کی لیکن جب دو سال بعد بیوی مر گئی تو پھر اس نے دوبارہ ایسی جرات نہیں کی۔ یا یہ کہ اس کی جرات کی پذیرائی نہیں کی گئی اور اس لئے وہ جس وقت مرا تو نہ گھر میں بیوی تھی نہ کوئی اولاد۔ اہل محلہ نے نام کو معمولی مراسم تجہیز و تکفین ادا کر کے اسے سپرد خاک کر دیا، اور صبح تک اسے بالکل بھول گئے۔

کہا جاتا ہے کہ جنت کی حوریں ہمیشہ جوان رہتی ہیں، وہی اٹھارہ سال کا آنکھوں میں چھپنے والا شباب، وہی نگاہ کنیزوں کی نیشی آنکھیں، وہی گوشہ و سلسبیل کے گوہر تاب پاتی سے دھلا ہوا نکھار رنگ، وہی لالہ لالہ چمکیلے بالوں کا ریشمی زنجیروں کی طرح لٹکتے رہنا، وہی نازک کمری، وہی غنچہ دہنی، وہی سر و قدی، وہی عشوہ زانی، الغرض وہ سب کچھ جو لطف و نشاط کا بہترین ساں کہا جاسکتا ہے، حوروں میں ہمیشہ یکساں تازگی، نرمی اور لچک کے ساتھ پایا جاتا ہے، لیکن ان کے چہروں پر جھریاں پڑتی ہیں، نہ بالوں میں سفیدی نمودار ہوتی ہے اور نہ ان کی ”شہر آشوب“ جوانی میں کبھی انحطاط ہوتا ہے، اس لئے جنت کی کوئی حور ایسی نہیں ہے جو دنیا کی پیدائش و اموات اور یہاں کی شیب و شباب سے پوری طرح واقف نہ ہو اور ہر ایسا واقعہ جس کا تعلق ان کی زندگی سے ہے، ان میں اضطراب نہ پیدا کر دیتا ہو۔

جہاں کوئی بچہ پیدا ہو، اس کے خط و خال اور صحت و توانائی کا حال معلوم کرنا انھیں فرض ہے، اور جہاں کسی نے تسبیح سنبھالی یا کسی جوان نے بڑھا پے میں قدم رکھا، پیشانی پر شکنیں ڈال لینا انھیں لازم، لیکن اسی کے ساتھ جب انھیں معلوم ہوتا تھا کہ کوئی نوجوان دم توڑ رہا ہے تو ان کے چہرے فرط مسرت سے چمک اٹھتے تھے، اس لئے جب زندگولا مرا تو حوروں کی جماعت میں کھلبلی مچ گئی کیونکہ ایسا ضعیف الاعضاء و مراض و زہاد اور بد صورت بڑھا ان کے علم میں اس سے قبل کبھی نہ مرا تھا اور ان میں سے ہر حور اپنی جگہ ڈر رہی تھی کہ کہیں وہ اس کے سر پر مسلط نہ کر دیا جائے۔

صبح کو جب حوریں اپنی اپنی آرایش کے کمروں میں بھیجی گئیں تو ان کے چہروں سے افسردگی برسر رہی تھی اور شکل سے ان کے قدم اٹھتے تھے، آئینے کے سامنے کھڑی ہوئی وہ اپنے بال سنوار رہی تھیں اور زندگولا کا گنجا سر ان کے پیش نظر تھا، آنکھوں میں سرمہ لگا رہی تھیں اور اس کی آنکھوں کا خیال جو پر بال کی وجہ سے ہمیشہ گندی رہتی تھیں، ڈرائے دیتا تھا وہ اپنی آنکھوں کی پوروں کو حنا آلود کر رہی تھیں اور اس کی موٹی اور سخت آنکھوں کا تصور انھیں ترستا رہا تھا۔ انھوں نے جلدی نہایت بددلی سے تمام مراسم آرایش و تزئین ادا کئے اور اس قصر میں جمع ہو گئیں جو موسیقی کی مشق کے لئے مخصوص تھا، انھوں نے اپنے اپنے دستارے کر حسب معمول سازوں پر آنکھیاں چلائی، لیکن چونکہ ان کے دل ملول تھے اس لئے بجائے اس کے کہ مدد میں انکی موسیقی سے سکون و نشاط پیدا ہوتا، آج اضمحلال طاری ہو گیا اور سازوں سے نکلنے والی آہنگ غم نے ایسی افسردگی پیدا کر دی

کہ فردوس کے بہت سے نازک پودے اور ان کے پھول متاثر ہو کر مرجھا گئے۔

چونکہ فردوس کی تاریخ میں یہ بالکل پہلا موقع تھا کہ وہاں غم و الم کے آثار پائے جائیں، اس لئے جنت کی تمام آبادی نے اس انقلاب کو فوراً محسوس کر لیا، اور ہر جنتی کو اس غمگین موسیقی نے اُس کی دنیاوی زندگی کی غمناکیوں کی یاد دلا کر یحییٰ کر دیا، طیور دم بخود ہو گئے، طاؤسوں نے اپنا رقص بند کر دیا، نسیم چلتے چلتے تھم گئی، دودھ اور شہد کی نہروں کی روانی بند ہو گئی، کوثر و سبیل کا پانی میلا ہو چلا اور جو سیب و انار ابھی پختہ نہ ہوئے تھے وہ بھی ڈالیوں سے علیحدہ ہو ہو کر گرنے لگے۔

رضوان جو فردوس کی کبھی نہ بدلے والی زندگی کے جمود سے بخوبی آشنا تھا اور نہایت اطمینان سے جنت کے ایک کونے میں بڑے خبر سوار ہوا تھا، دفعۃً اس ہنگامہ سے جاگا اور ابھی وہ آنکھیں مل ہی رہا تھا کہ ایک فرشتہ بارگاہ قدس کے سمت سے آتا ہوا نظر آیا اور ایک فرمان دیکر چلا گیا۔ فرمان میں درج تھا:-

”فردوس کا غم میرے پاس پہنچا اور حوروں کی میزاریاں پیش کر۔ اہل فردوس مضحل ہیں اور تو بے خبر بارگاہ قدس سے کوئی باز پوشیدہ نہیں، لیکن میرا فرض ہے کہ سارا حال تحقیق کر کے وہاں تک پہنچاؤں، اپنی مینڈ ختم کر قبل اس کے کہ تازیانہ خداوندی کی آواز تجھے بیدار کرے اور اس سے پہلے کہ دوسری صبح کی سپیدیاں افق سے نمودار ہوں۔ تو مفصل کیفیت مجھ سے آکر بیان کر۔“

”عدنائیل“

یہ تھا فرمان فردوس کے اس ناظم اعلیٰ کا جس کے ذریعہ سے تمام احکام خداوندی رضوان کو پہنچتے تھے اور جس پر جنت کے تمام طبقات کا انتظام منحصر تھا۔

(۴)

عہد قبل مسیح میں حوروں کی حالت وہ نہ تھی جو اب نظر آتی ہے۔ اُس وقت وہ حد درجہ مطیع و فرمانبردار، بے انتہار وادار اور خاموش طبیعت والیاں تھیں۔ وہ ہر جنتی کی پذیرائی کے لئے آمادہ رہتی تھیں، خواہ کیسا ہی غبی و جامد کیوں نہ ہو اور وہ عدنائیل کے ہر فرمان کی اطاعت اپنا فرض سمجھتی تھیں خواہ وہ کیسا ہی مستبد ہو۔ لیکن جب مسیحیت کی ترقی کے ساتھ ساتھ کبر ارض کے نسوانی طبقہ میں حریت و آزادی کے جذبات ترقی پذیر ہوئے، تو حوریں بھی متاثر ہوئیں اور تمام جدید فیشن طرازیوں کے ساتھ آزادی کی روح بھی ان کے اندر پیدا ہو گئی۔

پہلے ان کا لباس صرف ایک ڈھیلہ کرتہ ہوتا تھا جو گھٹنے تک جسم کو ڈھانکے رہتا تھا اور بال بھی اپنی فطری حالت پر چھوڑ دئے جاتے تھے، لیکن اب یہ کیفیت تھی کہ ایک ایک حور سو سو قسم کے بال بناتی، سنہری عینک استعمال کرتی، غازہ لگاتی، اونچی ایڑی کا جوتہ، دستانہ، ریشمی موزہ، بلاؤز اور پیٹی کوٹ وغیرہ سبھی کچھ اس کے پاس ہوتا، جس میں وہ روزانہ نت نئی ایجاد سے چار چاند لگا دیتی اور آزادی کا جو عالم تھا وہ رنگولا کے واقعہ سے ظاہر ہے کہ جب رضوان نے عدنائیل کے فرمان کی تعمیل میں اس ہنگامہ کی تحقیق شروع کی تو تمام حوریں ایک جگہ جمے ہوئیں اور باقاعدہ جلسہ کر کے رنگولا کے داخلہ فردوس کے متعلق نہایت سخت صدائے احتجاج بلند کی۔

اس جلسہ میں جو کوثر کے ساحل رطوبی کے قریب ایک میدان میں زیریں شامیانے کے نیچے منعقد ہوا تھا، حوریں کثرت سے شریک ہوئیں اور اپنی پوری شان و دلربائی کے ساتھ ہر حور نے ایک نیا لباس سس پہنا۔ ان کا ادھر ادھر چلنا پھرنا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا دنیا کی تمام مختلف رنگ کی تیتریاں یک جا مجتمع ہو گئی ہیں۔ ان کے لباس کے شوخ رنگوں کے امتزاج سے قوس قزح کی سی کیفیت پیدا تھی یا یوں کہئے کہ کسی مثلثی شیشے سے نکل نکل کر آفتاب کی کرنوں کے تمام اجزائے ترکیبی منتشر ہو کر رہ گئے تھے۔ یوں تو اب ہر حور اپنی جگہ شوخ و برباک تھی۔ لیکن ان میں بھی خصوصیت کے ساتھ چار حوریں بہت زیادہ دلیر اور چربہ تھیں

یہی ہر کام میں پیش پیش رہتی تھیں اور انھیں کے اشارہ پر تمام حویں چلتی تھیں۔ یہ جلسہ بھی انھیں کے اہتمام سے منعقد ہوا اور انھیں میں سے ایک حور جس کا نام خضرہ تھا اور جو عروں میں سب سے زیادہ حسین و ممتاز تھی، جلسہ کی صمد قرار پائی۔ جس وقت وہ ایک الماسی گرہی پر بیٹھنے کے لئے اٹھی تو مجمع کے نازک ہاتھوں سے بلند ہونے والی آواز ہر جہاں طرف سے بلند ہوئی اور اس آواز کی گونج میں اس نے ڈانس پر چڑھ کر جماعت کو ان الفاظ میں مخاطب کیا:-

”بہنو، اس سے قبل صدارت کا فخر مجھے بار بار حاصل ہوا اور ہر مرتبہ میں نے نہایت مسرت سے اسے قبول کیا، لیکن آج کا جلسہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے اس قدر اہم ہے کہ کسی ذمہ داری کی خدمت کو قبول کرتے ہوئے مجھے ڈر معلوم ہوتا ہے، اور اس لئے اگر میں اپنے فرض سے جہدہ برآں ہو سکتی ہوں تو مجھے ہر طرف غلامت نہ بنائے کیونکہ مجھے یقین ہے کہ اس مسئلہ کا بارگاہ قدس تک پہنچنا ضروری ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ وہاں ہمارے مطالبات کا کیا حشر ہو۔

بہر حال اب جبکہ آپ نے اپنی متفقہ آواز سے مجھ پر اس اہم ذمہ داری کا بار ڈال دیا ہے، میں انکار بھی نہیں کر سکتی اور گوشمش کروں گی کہ اپنی بساط بھر اس مسئلہ میں آپ کی رہنمائی کروں۔

گزشتہ نصف صدی کے اندر ہماری جماعت نے جذبات کے لحاظ سے جس قدر ترقی کی ہے وہ نہ اب اہل جنت کے لئے راز ہے نہ جناب عدنائیل کے لئے لیکن عمل کے لحاظ سے ہماری کوششیں ابھی تک ابتدائی حالت سے بھی نہیں گزری ہیں۔

بہرچند یہ حقیقت مجھ پر اس وقت تک روشن نہیں ہو سکی کہ ایک انسان سے ہمارا تعلق کس نوع کا ہے اور ہم میں وہ کیا بات ہے کہ ایک انسان ہم کو حاصل کرنے کی غرض سے اپنی ساری عمر ترک لذات میں بسر کر دیتا ہے۔ لیکن اب تو سوال یہ ہے کہ انسان میں وہ کونسی خوبی ہے جس کا لحاظ کر کے ہمارے تمام جذبات اس قدر آسانی کے ساتھ پامال کر دئے جاتے ہیں۔

انسان کی ہستی، جہاں تک میں نے غور کیا، عبارت ہے اس کی صورت و سیرت کی مجموعی حیثیت سے جس کا وہ اپنے ظاہری خط و خال سے کیسا ہے اور اس کے اخلاق کی حالت کیا ہے، لیکن یہ بھی کرمہ ارض کے باشندوں کی گھیب و غریب خصوصیت ہے کہ ان میں ان دونوں حیثیتوں کا ایک ساتھ جمع ہونا ضروری نہیں ہے، دیکھنا چاہئے کہ ایک اچھے اخلاق کا انسان صد درجہ مکروہ صورت رکھتا ہے، وہ ایک حسین خط و خال رکھنے والا آدمی نہایت بد اخلاق ہوتا ہے، جس کا کھلا ہوا نتیجہ سوا اس کے کچھ نہیں کہ فردوس چند دن میں بد صورت انسانوں سے بھر جائے گی اور جنت جس کا تعلق اخلاق و عمل سے نہیں بلکہ صرف جذبات سے ہے، دوزخ سے بدتر نظر آنے لگے گی۔ کہا جاتا ہے کہ اصل حسن اخلاق کا حسن ہے، ممکن ہے دنیا میں اس نفل کا کوئی مظہر ہو، لیکن چونکہ فردوس دار العمل نہیں ہے اس لئے ہم سمجھنے سے عاری ہیں اور صرف اسی چیز کی قدر کر سکتے ہیں جو ہمیں دیکھنے میں آجی معلوم ہو وہ خاص واقعہ جس نے آج ہمیں یہاں جمع ہو کر گنگو کرنے پر مجبور کیا ہے۔ دنگو لا کی سوت کا ہے جو اپنے اغال کے لحاظ سے صد درجہ خوش اخلاق اور سیرت کے لحاظ سے بہت نیک سمجھا جاتا ہے، لیکن صورت کے لحاظ سے وہ یقیناً فردوس میں بار بارنے کے قابل نہیں۔

افسوس ہے کہ ہم دو شیرہ حویں کو ان عروں کا پورا علم حاصل نہیں جو متاہل زندگی بسر کر رہی ہیں اور نہ ان کا حال معلوم ہے جن کی خدمت پر مامور کی جاتی ہیں تاہم جہاں تک قیاس کام دیتا ہے ہم سمجھنے پر مجبور ہیں کہ ان کی زندگی بہت تلخ گزرتی ہوگی اور طبائع کا اختلاف دونوں کو ایک دوسرے سے بیزار رکھتا ہوگا، بہر حال ایسا ہونا نہ ہو کم از کم ہم کو ضرور اپنے مستقبل کی فکر کرنی چاہئے اور ہم کو عزم کر لینا چاہئے کہ اس مرتبہ معاملہ صرف عدنائیل کے رحم پر نہ چھوڑ دیا جائے گا۔ بلکہ بارگاہ قدس تک پہنچنا کر وہاں سے غرام حاصل کیا جائے گا۔ تاکہ یہ روزہ وز کی زحمت کسی طرح دور ہو اور ہم لوگ امن و سکون کی زندگی بسر کر سکیں۔

کہا جاتا ہے کہ فردوس سے زیادہ سکون کہیں نہیں، لیکن کہنے والے اگر ہمارے حال کو دیکھیں اور معلوم کریں کہ دنیا کا ہر مقولہ درست

نہیں بھاگتا، اسی کے ساتھ میں یہ بھی کہوں گی کہ اگر موجودہ اصول میں کوئی تبدیلی نہ پیدا کی جائے، تو پھر ہمیں فردوس سے علیحدہ کر دیا جائے کہ اس صورت میں ہماری قوت انتخاب تو آزاد رہے گی۔

صدارت کی اس تقریر سے تمام حوروں میں حدود و جوش پیدا ہو گیا اور کئی تقریریں ہونے کے بعد آخر کار یہ قرار پایا کہ اسی وقت ایک میموریل طیار کیا جائے تاکہ جب یہ مسئلہ ہمارے مخالفین کی طرف سے بارگاہ قدس میں پیش ہو تو ہمارے مطالبات و غزوات پر بھی آسانی سے غور کیا جاسکے۔

آخر کار دو تین گھنٹے کے بحث و مباحثہ کے بعد ایک میموریل طیار کیا گیا اور ایک ورق زر پر نورانی حروف میں تحریر کر کے تمام حوروں کے دستخط اس پر حاصل کئے گئے۔ اس کے بعد پانچ ممتاز حوروں کا وفد رضوان کے پاس پہونچا، وہ اس وفد کو دیکھ کر چونکا لیکن قبل اس کے کہ وہ گفتگو کی ابتدا کرتا، اس وفد نے اپنا میموریل اس کے حوالہ کیا اور وہیں نورانی فصاحت غائب ہو کر اپنے اپنے مستقر کو چلی گئیں، میموریل کا خلاصہ یہ تھا:-

یہ پائے عرش کبریائی، یہ بارگاہ حرم بے ہمتائی، خداوند قدوس لم یزل ولا یزال، ایزد مطلق، صاحب بزل و نوال ہم کو جنت کے اس طبقہ سے متعلق ہونے کی پہنچتی حاصل ہے جو سب سے زیادہ مظلوم و پامال ہے اور ازل سے لے کر اس وقت تک جس کے جذبات کو مجروح کیا جا رہا ہے، سنتے ہیں کہ تو نے ہماری تخلیق میں فن جمالیات کی تمام نزاکتیں صرف کر دی ہیں۔ اور اس بات کو اتنی شہرت دیری ہے کہ کرۂ ارض کا کثیف باشندہ بھی اپنی موت کا غم ہماری تمنائیں بھول جاتا ہے، لیکن اسے معبود برتر و اعلیٰ، اس حقیقت کے سمجھنے سے ہماری عقلیں عاجز ہیں کہ تو نے ایک نورانی مخلوق کو خاکی پتلوں کا تابع کیوں بنا دیا، اور باوجود اس کے کہ تو نے ہمارے اندر تمام رنگینیاں، تمام الماسی تابناکیاں، جملہ کافوری صباحتیں اور ہلالی نزاکتیں بھر دی ہیں۔ لیکن ہم اس پر بھی مجبور کئے جاتے ہیں کہ ایک کثیف انسان، ایک سیاہ برود انسان، ایک غیر جہذب و ناشائستہ انسان کی خدمت میں رہ کر اپنے تمام ان لطیف احساسات و جذبات کو پامال ہوتا دیکھیں کیا تیرے عدل کا یہی تقاضا ہے، کیا تیری بارگاہ کا یہی انصاف ہے، نہیں، نہیں ہرگز نہیں، ہمیں معلوم ہے کہ اس میں بڑا حصہ عزرائیل کے ظلم و استبداد کا شان ہے جس کو تو نے فردوس کا حاکم اعلیٰ مقرر کیا ہے اور تو کبھی اس کو گوارا نہ کرے گا۔ اس لئے ہم نہایت مجتہد و الحاج کے ساتھ اپنی شکایت کا اظہار کر کے ملتس ہیں کہ:-

۱۔ کسی انسان کے جنت میں داخل ہونے کا سبب صرف اس کا زہد و تقاؤ نہ قرار دیا جائے بلکہ اسی کے ساتھ ظاہری اخلاق، حسن معاشرت، تہذیب و شائستگی کا بھی لحاظ رکھا جائے۔

۲۔ کوئی ایسا انسان جس نے نہایت کمزور صورت پائی ہے، وہ کسی حال میں بھی فردوس کا مستحق نہ سمجھا جائے خواہ اسے عبادت میں ساری عمر ہی کیوں نہ صرف کر دی ہو اور اگر فردوس میں اس کا آنا ضروری ہو تو صرف سلبی و کثر کے ساحلوں پر پھرنا اور باخوں میں رہ کر میوے کھاتے رہنا اس کے لئے مخصوص کر دیا جائے اور ہمارے اس کے درمیان ایک ایسا حجاب پیدا کر دیا جائے کہ ہم اسے دیکھ سکیں اور نہ وہ ہمیں۔

۳۔ جب کوئی انسان جنت میں داخل ہو اور اس کو یہاں کی تمام لذتیں حلال کر دی جائیں تو اسی کے ساتھ ان کی وضع قطع، تراش، خراش (جس میں وارہی، موچہ اور لباس وغیرہ کے تمام جزئیات شامل ہوں گے) تہذیب و معاشرت کا انتظام ہمارے سپرد کیا جائے اور اس وقت تک کہ وہ ہمارے ذوق کے معیار پر پورا نہ اترے، ہماری معیت سے محروم رہے۔

۴۔ اس رقت یہ دستور جاری ہے کہ جن حوروں کے تضرعتوں سے آباد ہو جاتے ہیں ان سے دو شیرہ عذریں نہیں مل سکتیں آئندہ یہ قاعدہ منسوخ کر کے متاہل و غیر متاہل حوروں کو باہم ملنے اور تہاد و خیالات کی اجازت دی جائے، اسی طرح ہمیں یہ بھی

اجازت دیجائے کہ جس جنتی سے اور جس وقت جی چاہے آزادی سے ملیں اور ہم کسی ایسے حکم کے ماننے پر مجبور نہ کئے جائیں جو ہماری آزادی کے منافی ہو۔

۵۔ جب ہم کو یقین ہو جائے کہ کسی جنتی کی حالت اصلاح پذیر نہیں ہے، تو ہماری درخواست پر اس کے ہمارے درمیان ایک حجاب حایل کر دیا جائے اور ہمارے دلوں سے اس کا خیال بھی محو کر دیا جائے کہ ماضی کی یاد ہمارے حال کو بدمزہ نہ کرے۔

۶۔ حسن و قبح کی جانچ بالکل ہمارے اوپر چھوڑ دیجائے اور قبل اس کے کہ کوئی شخص جنت میں داخل ہو، ہماری رائے طلب کر لی جائے اور ہماری تجویز کے مطابق عدنائیل احکام جاری کرے۔

۷۔ اگر مذکورہ بالا مطالبات میں سے ایک مطالبہ بھی ناقابل قبول ہو تو پھر ہماری استدعا یہ ہے کہ جنت سے علیحدہ کر کے کسی ایسی جگہ آباد کر دیا جائے جہاں ہم کو آزادی حاصل ہو۔ خواہ اس کے لئے ہمیں کتنی ہی جسمانی و روحانی تکالیف کیوں برداشت کرنی پڑیں۔

(۳۴)

حوریں صفت بستہ کھڑی ہیں، عدنائیل و رضوان سر جھکائے ہوئے کھپکھپ رہے ہیں، تمام فضا برق آلود ہو رہی ہے خلا کاروشن سکون، ہر ہر چیز پر مستولی ہوا و سکوت مطلق سے مغلوب ہو کر ہر ہر ذرہ جامد و غیر متحرک نظر آ رہا ہے۔ عرصہ تک یہی مرحوب کن حالت قائم رہی اور پھر دفعتاً فضا کا نور سخت آواز کے ساتھ شق ہوا اور اس آواز نے آہستہ آہستہ ایک مفہوم اختیار کر لیا جو ان الفاظ میں ظاہر کیا جاسکتا ہے:-

”اے عدنائیل و رضوان، حوروں کے تمام مطالبات تمہاری وساطت سے ہم تک پہنچے اور باوجودیکہ حقیقت کا علم صرف ہم کو حاصل ہے لیکن چونکہ مخلوق پر ظلم کرنا ہمیں پسند نہیں اور نہ ہم کسی کو اس کی عقل کے خلاف راستہ چلنے پر مجبور کرتے ہیں اس لئے ہم انکی آزادی سے برہم نہیں اور چاہتے ہیں کہ ان کے لئے ضرور ایسے اسباب مہیا کئے جائیں کہ وہ خود حقیقت کو سمجھ لیں۔

ہم یہ نہیں کہتا چاہتے ہیں کہ حوریں اپنی جس صورت پر ناز کر رہی ہیں اس کے حسن و جمال کا قیام منحصر ہے صرف اس بد صورت جنتی کے اخلاق پر جس سے وہ اس قدر گریز کرتی ہیں اور ایک جنتی کی صورت نہیں بلکہ اس کے اخلاق ہی حسین ترین صورت میں فردوس کے اندر داخل ہوتے ہیں۔ اس لئے ہم حکم دیتے ہیں کہ تمام ان حوروں کو جو آزادی کی طالب ہیں جنت سے علیحدہ کر کے کرۂ ارض میں لیایا جائے اور یورپ میں منتشر کر دیا جائے اسی کے ساتھ ان کو یہ بھی اجازت دیجائے کہ وہ انسانوں سے اپنی اپنی پسند کے مطابق رشتہ اتھاو قائم کریں اور اپنے ان جذبات کو جن میں کا تعلق ان کے گوشت پوست سے ہے، نہایت آزادی سے کام میں لائیں، یہاں تک کہ ان کے اخلاق بالکل محو ہو جائیں اور کرۂ ارض کی آبادی ان کے وجود سے بہتر اور آخر کار خود ان کو بھی اپنی زلیست سے بہتر اور گروہ نہ

اگر ہاں تک کسی ماہ کا پرچہ آپ کو نہ ملے

تو اطلاع ملنے پر آئندہ ماہ کے پرچہ کے ساتھ ہم اپنے صرف سے فریہم کر دیں گے، لیکن اگر آپ اس سے قبل چاہیں گے تو بیرنگ روانہ ہوگا (کیونکہ مہینہ کے اندر اندر پیٹ بھیجے میں ہم کو ہر گز محصول ادا کرنا ہوگا) اس لئے جب آپ پرچہ نہ پہنچنے کی اطلاع دیں تو یہ ضرور لکھ دیجئے کہ آپ فوراً چاہتے ہیں یا اگلے پرچہ کے ساتھ۔

نیچر نگار

”گاہے گاہے باز خواں“

خدا کا صحیح تصور

دنیا نے شاعری میں وجود باری پر سب سے زیادہ پاکیزہ خیال مرزا عبدالقادر بیدل کا ہے جنہوں نے احساس بے جا رنگی و بے کسی کا نام خدا رکھا ہے۔ لکھتے ہیں :-

✓ علاج نیست داغ بندگی را اگر بیشم و گر کم آخر یزد

اسی خیال کو اکبر الہ آبادی نے اس طرح ظاہر کیا ہے :- ”بندگی حالت سے ظاہر ہے خدا ہو یا نہ ہو“

خیر یہ تو شاعرانہ باتیں ہیں اور ان لوگوں کے تاثرات ہیں جن سے انکار خدا پر بھی باز پرس نہیں ہو سکتی۔ لیکن لطف تو یہ ہے کہ جب ہم شاعری سے قطع نظر حکمت و فلسفہ، علم و تحقیق سے مدد چاہتے ہیں تو بھی نتیجہ وہی نکلتا ہے جو بیدل یا دوسرے شعراء نے سمجھایا ہے اور یہاں بھی اعتراف عجز ہی سے معرفت الہی کی بصیرت شروع ہوتی ہے :-

آئیے آج کی صحت میں اس اجمال کی تفصیل پر متوجہ ہوں۔

کائنات اور اس کی وسعت کو تو خیر جانے دیجئے کہ ضرورت اس ”آسمان پروازی“ کی نہیں ہے بلکہ اسی زمین پر رہنے اور بننے کی حیثیت سے ہمیں سب سے پہلے ”کارزمین“ ہی کو دیکھنا چاہئے کہ خدا نے اپنے آپ کو ہم سے قریب الفہم بنانے کے لئے کچھ دلائل و خواہد یہاں چھوڑے ہیں یا نہیں۔

زمین کے موجودات تین قسموں میں منقسم ہیں۔ ایک وہ جو زندگی رکھتے ہیں اور حرکت ارادی کے بھی مالک ہیں مثلاً انسان، شیر، مچھلی، چڑیا وغیرہ اور اس قسم کو حیوان کہتے ہیں دوسری قسم میں وہ مخلوقات ہیں جو زندہ تو ہیں لیکن حرکت ارادی سے محروم اور ان کا نام نباتات ہے، تیسری قسم وہ ہے جو نہ زندہ ہے نہ حرکت ارادی پر قادر، جیسے مٹی، پانی، ہوا، اور اسے جمادات کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ تینوں قسمیں ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ ہیں اور کبھی یہ نہیں ہو سکتا کہ پتھر کا ٹکڑا ترقی کر کے گلاب کا درخت ہو جائے اور گلاب ترقی کر کے انسان بن جائے لیکن کس قدر حیرتناک امر ہے کہ باوجود اس قدر ظاہری و معنوی بعد و تفریق کے جس وقت ان تینوں کی کیمیادی تحقیق کی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان سب کی بنیاد ایک ہی ہے یعنی یہ سب کے سب پیدا ہوئے ہیں انہیں ”موادِ حامدہ“ سے جو نہ جان رکھتے ہیں نہ حرکت ارادی پر قادر ہیں اور جن کا نام علمی دنیا میں ”عناصر“ رکھا جاتا ہے۔

آپ گیہوں کا دانہ زمین میں ڈالتے ہیں اور یہ دانہ مٹی، پانی اور ہوا سے بعض عناصر جذب کر کے رفتہ رفتہ درخت کی شکل اختیار کرتا ہے جس سے وہی گیہوں پیدا ہوتا ہے، آپ لیموں کا تخم بوتے ہیں اور لیموں ہی حاصل کرتے ہیں۔ آپ مرغی کے انڈے کو ایک متعین مدت تک گرمی پہونچا کر اس سے مرغی ہی کا بچہ پیدا کرتے ہیں، مرغابی کے انڈے مرغابی اور کچھوے کے انڈے سے کچھوے ہی نکلتے ہیں۔ تاثر یہ ہے کہ ان سب کی ترکیب انہیں عناصر سے ہوئی ہے جو بے جان ہیں جن میں کوئی حرکت ارادی نہیں لیکن کیا ممکن ہے کہ گیہوں کے تخم سے نارنگی اور طاؤس کے انڈے سے سانپ پیدا ہو سکے، پھر سوال یہ ہے کہ جب بنیاد سب کی ایک ہی ہے تو یہ تفریق کیسی، اور حیات کی صورتوں میں یہ تنوع اور نیرنگی، یہ بے قوفی کہاں سے آئی؟

اہل علم اس راز کے دریافت کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ رکھتے ہیں اور وہ یہ کہ مختلف زندہ اجسام کا تجزیہ کریں اور دیکھیں کہ حیوانات

و نباتات کے اجزاء ترکیبی اور نباتات و جمادات کے اجزاء حیات میں کیا فرق ہے لیکن جب انھوں نے یہ عمل کیمیاوی کیا تو ہر صورت میں وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ تمام موجودات خواہ وہ جاندار ہوں یا بے جان چند عناصر بسیط سے مرکب ہیں جو بالکل بے جان ہیں۔ پھر انھوں نے خیال کیا کہ ممکن ہے ان کو متحدہ کرنے سے یہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہو۔ اس لئے آؤ ان کو پھر ملا کر دیکھیں لیکن ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب انھوں نے دیکھا کہ وہ عناصر کو ایک بار متحدہ کرنے کے بعد باہر گر ملا ہی نہیں سکتے اور اگر کسی طرح ملا دیں تو اُن میں کوئی آثار حیات پیدا نہیں ہوتے۔

ایک عندلیب ہمارے سامنے پہچان رہا ہے، طرح طرح کے نئے اس کی متعارف سے پیدا ہو رہے ہیں۔ پاس ہی ایک گلاب کا دخت ہے جس کے رنگین پھولوں کی خوشبو ہمارے دماغ کو معطر کر رہی ہے اور وہیں ایک پتھر کا وزنی ٹکڑا ہے جس کو ہمارے ہاتھ آسانی سے اٹھیں سٹھا سکتے، لیکن جب ہم عندلیب کو ہلاک کر کے اس کی ترکیب حیات کی جستجو کرتے ہیں، گلاب کا پھول توڑ کر اس کے عناصر دریافت کرتے ہیں پتھر کے اجزاء و تحلیل کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اجزاء بالکل جامد ہیں بے جان ہیں، نہ اُن میں کوئی آواز ہے نہ نغمہ، نہ خوشبو نہ وزنی اور مطلق ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کیا چیز تھی جو ہمیں کے حقیقہ میں ایک دنیا کے نغمہ، پھول کی ضعیف و نازک شکل میں ایک ہنگامہ نکھرت اور پتھر کے سکون یا رد میں ایک وزن اعصاب شکن کی کیفیت رکھتی تھی۔ پھر جب یہ صورت تحقیق و تفتیش کی کسی نتیجہ تک نہ پہنچا کہ تو انھی علماء نے جستجو کی ایک اور راہ اختیار کی جو یقیناً زیادہ بافع نظری پر مبنی تھی انھوں نے ایک آلہ ایجاد کیا جس کا نام خوردبین ہے اور جو اجسام صغیرہ کو لاکھوں کروڑوں گنا بڑا کر کے دکھاتا ہے اس کے ذریعہ سے جب انھوں نے زندگی کے راز کو دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ زندہ اجسام میں بہت سے چھوٹے چھوٹے جراثیم پائے جاتے ہیں جو شفاف ہیں، بے رنگ ہیں اور کچے انڈے کی پیدری کی طرح پسند و ناپسند یہ جراثیم مختلف شکل کے ہیں اور نباتات و حیوانات کے اندر ہر وقت حرکت کرتے رہتے ہیں، ان کا مشغلہ یہ ہے کہ آس پاس سے بطور غذا مواد جامد حاصل کر کے کسی ایسے طریقہ سے جس کا علم اس وقت تک انسان کو حاصل نہیں ہو سکا، ان کو زندگی بخشتے ہیں اور پھر اعضا و شراپیں، عضلات وغیرہ میں تبدیل ہو جاتے ہیں، لیکن یہ نظام اتنا مکمل ہے کہ جو جراثیم ہماری بنانے کے لئے متعین ہیں، وہ ہڈی ہی بنا دیتے جو پتی کی تشکیلیں پر مامور ہیں وہ پتی ہی ترتیب دیں گے اور جن کے پیر و پل بنانے کی خدمت ہے وہ سوائے پھل کے کچھ نہ بنا سکیں گے ظاہر ہے کہ ان جراثیم کو ایک ہی قسم کا ماحول حصول غذا کے لئے ملتا ہے۔ لیکن باوجود اس کے نتیجہ وہی ایک ہوتا ہے، یعنی پھل کی جگہ نہ کوئل اگتی ہے اور نہ ٹھنی کے بجائے پھول اور آخر کار یہ جراثیم تمام جسم میں، شراپیں میں، اعصاب میں، عضلات میں، انفرس ہر جگہ اس قدر کثرت کے ساتھ پھیل کر ایک ہستی کا جزو ہو جاتے ہیں کہ سوئی کی نوک کے ہزاروں حصہ کے برابر بھی جسم کا کوئی حصہ اُن سے خالی نہیں۔

یہ صحیح ہے کہ یہ تمام جراثیم چند ابتدائی جراثیم سے پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ سب سے پہلے زندہ جراثیم جو ان جراثیم کی آفرینش کا باعث ہوا کیا تھا؟ اس میں زندگی کس چیز نے بخشی اور پھر اس سے مختلف خواص و کیفیات رکھنے والے لاکھوں کروڑوں سے بھی زیادہ ناقابل شمار جراثیم کیونکر پیدا ہوئے۔ یہ سوال ایسا ہے جس کا جواب اب تک کسی بڑے سے بڑے عالم سے بن نہیں پڑا اور یہی وہ عجیب و غریب کسی قوت برتر و اعلیٰ کے تسلیم کرنے کی طرف ایک شخص کی رہبری کرتا ہے۔

آپ کسی کارخانہ میں عایش گئے تو دیکھیں گے کہ بڑے دیو پیکر آہنی پیسے ہر وقت گردش میں ہیں، بہت سے آلات ادھر سے ادھر تیزی سے حرکت کر رہے ہیں۔ ایک منظم طریقہ سے مشینوں کے تمام پیرزے اپنا کام کر رہے ہیں۔ لیکن دیکھنے کے بعد کیا ایک لمحہ کے لئے بھی یہ خیال کسی کو پیدا ہو سکتا ہے کہ یہ تمام حرکت و جنبش، یہ تمام نظم و عمل از خود پایا جاتا ہے۔ یقیناً عقل انسانی اس کا سبب دریافت کرے گی اور جب اس کو معلوم ہو جائے کہ یہ سب اس بھاپ کی قوت سے ہو رہا ہے جو کوئلہ اور پانی کی مدد سے پیدا کی جاتی ہے تو وہ مطمئن ہو جائے گا۔ پھر جب ایک معمولی مشین کا وجود اور اس کی حرکت و عمل بغیر کسی موجود و محرک کے نہیں ہو سکتی تو قدرت کے یہ بیشمار مظاہر آثار، موجودات کی کروڑوں صورتیں کس طرح از خود ظہور میں آ سکتی ہیں خیر اس مشین کی مثال چھوڑئے کہ یہ ایک نہایت ہی فرسودہ طریق استدلال ہے آپ اُن چھوٹے چھوٹے جاندار کیڑوں کو لیجئے جن کو نگاہ

نہیں دیکھ سکتی اور جو اس حد تک غیر مرئی ہیں کہ ہزار اند ہزار ان کو جمع کیا جائے تو بھی سرسوں کے دانہ سے زیادہ ان کا حجم نہیں ہوتا پھر لطف یہ ہو کہ یہ تمام خرد بینی کیڑے اور نہاتات بالکل اسی طرح پیدا ہوتے بڑھتے اور فنا ہوتے ہیں، جیسے تمام ذی حیات مخلوق اور علم انسانی آج تک نہ ان کی حقیقت آفرینش کو دریافت کر سکا اور نہ اس امر پر قادر ہوا کہ ان تمام حقیر مخلوقات میں سے کسی ایک ہی مخلوق کے کسی ایک ہی عضو کو بنا سکتا۔ یہ صحیح ہے کہ انسان ہوا میں پرواز کرتا ہے، برق اور کبریا کے ذریعہ سے زمین کی طنائیں کھینچے ہوئے ہے۔ اپنی ایجادات و اختراعات سے اس نے انسانی زندگی کے اصول کو بالکل بدل دیا ہے لیکن بائیں ہمت ساری دنیا کے ماہرین کیمیا و حیاتیات و فضلاء کثیرین کو جمع کر کے دریافت کرو کہ کیا وہ مچھر کی ایک آنکھ کی طرح کوئی آنکھ بنا سکتے ہیں۔ مکھی کی ایک ٹوٹی ہوئی ٹانگ کی طرح کوئی عضو بنا کر دکھا سکتے ہیں؟ تو وہ اس پر قادر نہ ہوں گے اور آخر کار ان سب آسمان و زمین کے قلابہ ملاپنے والوں کو اعتراض کرنا پڑے گا کہ یہ ان کے امکان سے باہر ہے۔

یہی انسان کا اعتراف عجیبی اس کی عقل و فراست کی حیثی، اور یہی اس کی بے چارگی و بے بسی ہے جہاں سے وجود باری کے وجود کے حدود شروع ہوتے ہیں اور آخر کار بقول رازی انسان کو کہہ دینا پڑتا ہے کہ اس کے پہچاننے کے لئے نہ کسی دلیل کی ضرورت ہے نہ کسی حجت و ہدایت کی کیونکہ کائنات ایک ایک ذرہ کی نگین اس حقیقت پر گواہی دے رہی ہے اور اسی کو ایک شاعر نے "ہر ورقے دفتریت معرفت کردگار" کے الفاظ میں ظاہر کیا ہے۔ اسی سلسلہ میں ایک امر اور بھی قابل غور ہے یعنی یہ کہ کیا خدا آفرینش کے اس سلسلہ کو قائم کر کے علحدہ ہو گیا ہے اور اب اسے دنیا کے نظام سے کوئی تعلق باقی نہیں رہا؟۔ بعض کا خیال یہی ہے۔ آئیے اس مسئلہ پر بھی ایک نگاہ جستجو ڈال لیں۔

ابھی بیان کیا گیا ہے کہ یہ تمام اجسام، شفاف و لیسدار جراثیم سے بنے ہیں اور ان جراثیم کی ترکیب تمام حیوانات و نہاتات میں ایک ہی ہیں، اچھا اب دیکھئے کہ ان جراثیم کی ترکیب کیمیاوی کیا ہے؟

یہ علم غالباً اکثر حضرات کو ہو گا کہ یہ جراثیم چار عناصر بسیط سے مرکب ہیں :- آکسیجن، ہائیڈروجن، نیٹروجن اور کاربن۔

کاربن ایک زہریلی گیس ہے۔ آکسیجن ایک گیس ہے جو اجسام کو مشعل کر دیتی ہے اسی طرح ہائیڈروجن ایک شفاف گیس ہے جو آکسیجن سے ملتی ہوتی ہے اور نیٹروجن بھی، لیکن ان کے باہم امتزاج سے جو نتائج پیدا ہوتے ہیں وہ اسکول کے ہر طالب علم کو معلوم ہوں گے کہ جب آکسیجن اور ہائیڈروجن دونوں گیسیں ملتی ہیں تو پانی وجود میں آتا ہے۔ چنانچہ سمندر، دریا، نہر اور بادل وغیرہ میں ہر جگہ پانی کا وجود انھیں دونوں گیسوں کے امتزاج سے ہے۔ نیٹروجن اور آکسیجن جب دونوں گیس کے تو تیزاب پیدا ہو گا۔ آکسیجن و کاربن جب ملیں گے تو ایک زہریلی گیس پیدا کریں گے اور ہائیڈروجن و کاربن مل کر قابل اشتعال گیس کی صورت اختیار کریں گے اور اگر یہ چاروں مل جائیں تو ظاہر ہے کہ انھیں مذکورہ بالا مرکبات میں سے کوئی نہ کوئی شکل پیدا ہوگی اور یہ محض نہیں کہ ان میں سے کوئی صورت حیات کے لئے مفید نہیں پھر سوال یہ ہے کہ وہ کیا چیز ہے جو ان عناصر بسیط کو مرکب کر کے جراثیم پیدا کرتی ہو اور اس خصوصیت کے ساتھ کہ نباتات پیدا کرے، جراثیم نباتات ہی پیدا کرے، حیوانات جراثیم حیوانات ہی بنائیں گے، بھی ایسا نہ ہو گا کہ پھول کے جراثیم کسی طائر کی ساخت میں مصروف ہو جائیں اور طائر کے جراثیم کسی انسان کی ترکیب میں۔ اگر یہ نظم و اہتمام جسے صرف نگہداشت ایزوی کوٹنا چاہئے شامل حال نہ رہے تو آکسیجن ہمارے جسموں کو جلا ڈالے، ہائیڈروجن سے مل کر تمام دنیا کو عالم آب بنا دے، نیٹروجن کے ساتھ ترکیب پا کر ہمارے اوپر تیزاب کا سا کام کرنے لگے گوشت بنانے والے جراثیم صرف خون بنانے لگیں اور ہم ایک رقیق چیز کی طرح ادرتے ادرتے پھریں۔ طرح ایک کاشتکار گیہوں بوئے اور مینڈکی اگنے لگیں، مرغی کو انڈوں پر بیٹھائیں اور ان سے سانپ پیدا ہونے لگیں، الغرض تمام نظم عالم درہم و برہم ہو جائے۔ اگر خدا کے وجود کو تسلیم کرنا فطرت انسانی ہے تو اس پر سمجھ کر کرنے کی ضرورت نہیں اور یہ اگر استدلال سے تعلق رکھتی ہے تو شواہد طبیعت اور مظاہر کائنات سے زیادہ مضبوط دلیل اور کیا ہو سکتی ہے۔

الغرض خدا نے جو دے انکار ممکن نہیں، لیکن اہل مذاہب اس کا اقرار کرتے اس طرح کہ عقل کو انکار کے سوا کوئی چارہ نہیں اور ہمیں سے دنیا میں "مزاج کشودیں" کی ابتدا ہوتی ہے۔ خدا نام ہے ایک "ازلی وابدی قوت" کا جس کا بہترین تصور اہل مذاہب میں نہیں بلکہ صوفیہ کے یہاں پایا جاتا ہے اور جس کو شعراء صوفیہ میں سے پیدل نے اس طرح ظاہر کیا ہے :-

بیدل آن گوہر نایاب سراف
بہ چھپے مست کہ پدید نیست
عکس افتادہ در آئینہ ہوش
گل توان گفت وے چیدن نیست

دین الہی کا پس منظر

اگرچہ سندھ میں مسلمانوں کے قدم جنے سے لیکر ۱۷۵۷ء میں مسلمانوں کے قدم اکھڑنے تک ہندوستان کے مسلمان سلاطین کا بالواسطہ یا بغیر واسطہ تعلق دربار خلافت سے بالخصوص اور ایران و عرب کے ہمسایہ اسلامی ملکوں سے بالعموم کسی نہ کسی حد تک ہمیشہ رہا تاہم ہندو مورخین کا کیا ذکر خود مسلمان مورخین نے ان اہم تعلقات کا ذکر کبھی بھی تفصیل سے نہیں کیا اور یہی وجہ ہے کہ متعدد مسلمان بادشاہوں کی سیاست کے اہم پہلو تشویش و تھک رہے اور منتشر قہقہے طرح طرح کی غلط فہمیوں میں مبتلا رہے۔ اسے کا شکی عصر حاضر کا کوئی مورخ ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کی تاریخ اسلامی نقطہ نظر سے مرتب کر سکے!

جلال الدین محمد اکبر کے دین الہی کو سمجھنے کے لئے اس کے جد امجد امیر تیمور کے وقت سے بدلتی ہوئی سیاست کا امعان سے مطالعہ کرنا ضروری ہے۔ امیر تیمور کے عصر میں دار الخلافۃ بغداد سے مقرر منقل جو چکا تھا اور عباسی خلیفہ کی حیثیت شاہ شہزادے کی رہ گئی تھی۔ امیر تیمور کے داخل و اقراں میں اگر کوئی مسلمان بادشاہ اس کا مقابل تھا تو وہ عثمانی ترک سلطان بایزید تھا۔ سلطان بایزید، امیر تیمور کو کسی خاص وقت سے نہیں دیکھتا تھا اور شاید اسی لئے بایزید نے امیر تیمور کے دوسرے داروں قرايوسف اور امیر ازبک خان کی امیر تیمور کے مقابلہ میں مدد کی اور جب تیمور نے قرايوسف کی واپسی کا مطالبہ کیا تو بایزید نے بلطائف الجیل مال دیا تیمور نے فوج کشی کی اور ۱۳۸۱ء کی جنگ انکورہ میں بایزید گرفتار کر لیا گیا اور بایزید کے جانشین کو تیمور کی اطاعت کا اقرار کرنا پڑا۔ چونکہ پروفیسر گبین کی تحقیق کے مطابق سلطان بایزید نے مصر کے عباسی خلیفہ کے اقتدار اعلیٰ کا بھی ذکر کیا تھا بنا بریں تیمور نے خلیفہ اللہ کا لقب اختیار کرنا مناسب سمجھا تاہم اہل سنت کے متفق علیہ عباسی خلیفہ کی برائے نام اطاعت کا بھی سوال پیدا ہوا اور مسلمانوں کا کم از کم ایک طبقہ ۱۷۵۷ء تک تیمور کی اولاد کو کبھی امام عادل کی شکل میں کبھی ”خلل سجانی“ کی صورت میں کسی نہ کسی حد تک اورنگ خلافت کا سہارا سمجھتا رہا۔ تیمور کے انتقال کے بعد پروفیسر بکسر لکچر ان مٹری یونیورسٹی کالج کے الفاظ میں ”سلطان محمد ثانی نے سورہ روم کی پیشین گوئی کو قسطنطنیہ فتح کر کے پورا کیا اور مشرق و مغرب کا دعویٰ دار بن بیٹھا اور آل تیمور کو طوعاً یا کرہاً اپنے پرانے حریف کے مقابلہ میں ایرانی بادشاہوں کا ساتھ دینا پڑا۔“ تاریخ رشیدی کے بیان کے مطابق جلال الدین محمد اکبر کے دادا ظہیر الدین محمد بابر کو سمرقند کی آباؤی سلطنت حاصل کرنے کے لئے شاہ اسماعیل صفوی سے مدد کی درخواست کرنا پڑی اور اس مدد

۱۔ Hughes: Dictionary of Islam

۲۔ ”تاریخ ادبیات ایران از پروفیسر براؤن عہد تاتار — — —“ پروفیسر گبین کی ”تاریخ — — —“ مقدمہ بہادر شاہ کے کاغذات
بحوالہ ”دین الہی“ ص ۱۱۱ مصنفہ کھن لال رائے چودھری۔

۳۔ میں یہ سمجھنے سے قائل ہوں کہ پروفیسر بکسر کو یہ غلط فہمی کیونکر ہوئی کہ سورہ روم میں مسلمانوں کے ہاتھ سے قسطنطنیہ فتح ہونے کی پیش بینی ہے؟ فاضل مشرق کے علی الرغم غلبت الروم فی الدنیا الارض وہم من بعد علیہم سیغلبون فی بضع سنین“ ارشاد فرما کر ایرانیوں کو بشارت دی گئی ہے۔ (طالب صفوی)

۴۔ جرنل آف دی رائل ایشیا سوسائٹی ۱۹۲۲ء

کے صلہ میں بابر کو نہ صرف شاہ تاج پہننا پڑا بلکہ اس کی حیثیت شاہ اسماعیل صفوی کے ایک سردار کی رہ گئی جو صفوی بادشاہ کو خوش رکھنے کے لئے اپنی مملکت میں بھی شیعہ عقاید کے مطابق سکے مسکوک کرتا تھا۔ نجم ثانی کے قتل کے بعد بھی شاہ اسماعیل صفوی بابر کی بددستی سے دست بردار نہیں ہوا بلکہ اپنے متعدد امراء کو بابر کی کمک کے لئے بھیجا تاکہ افغانستان فتح ہو سکے۔ اگرچہ بابر نے اپنی تزک میں اور ابن فضل نے آئین اکبری وغیرہ میں اس امر کا انخفا کرنے کی سعی کی ہے کہ بابر، شاہ اسماعیل کا بیٹا تھا لیکن بابر نامے سے مترشح ہوتا ہے کہ خود بابر کا میرمنشی شیخ زین سیکری کی جنگ تک اسے نواب لکھنے پر اکتفا کرتا تھا بلکہ تاریخ گیلان مصنف عبدالفتاح سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاہ اسماعیل صفوی کے جانشین کم از کم نور الدین جہانگیر کے عہد تک مغل فرمانروایان ہند کو اپنا نائب سمجھتے رہے۔ تاریخ گیلان کے اصل الفاظ نور الدین جہانگیر کو ”نواب شاہ سلیم فرمانروائے ہندوستان“ سے یاد کرتے ہیں۔ شاہان مغلیہ اور بادشاہان صفویہ کے مراسلات کے القاب سے بھی اس امر پر روشنی پڑتی ہے کہ اول الذکر احساس کمتری اور آخر الذکر احساس برتری میں کافی عرصہ تک مبتلا رہے لیکن جہاں تک حقیقی اقتدار کا سوال ہے وہ کم از کم ہندوستان کی سرحد میں بادشاہان صفویہ کو کبھی بھی حاصل نہیں ہوا اور بابر یا ہمایوں نے کابل کو خیر باد کہنے کے بعد اپنے آپ کو کبھی بھی شاہ اسماعیل یا طہماسپ صفوی کا نائب نہیں سمجھا اور شیعہ کے اظہار کے برعکس خلوت اور خلوت میں قسطن کا اظہار کیا چنانچہ بابر نے فتح ہندوستان کے بعد خلیفہ المسلمین کے نام کا خطبہ کبھی نہیں پڑھا اور لاہور کے دارالضرب میں جو سکے مسکوک ہوئے ان پر ائمہ اثنا عشر کے اسماء کے بجائے خلفائے راشدین کے اسماء درج کئے گئے۔

نصیر الدین ہمایوں، شیر شاہ سے شکست کھانے کے بعد بھی ایران جانے کے لئے بیتاب نہیں تھا اور اگر بیرم خاں (جو مذہباً شیعہ تھا) زور نہ دیتا تو شاید ہمایوں صفوی بادشاہ کا ممنون احسان ہونا پسند کرتا۔ بہر نوع بیرم خاں کے اصرار یا دوسروں سے انقطاع امید کی وجہ سے ہمایوں ایران گیا اور صاحب احسن التواریخ اور دوسرے ایرانی مورخین نیز گلبدن بیگم کے بیان کے مطابق شاہ طہماسپ صفوی نے ہمایوں کا شاہانہ خیر مقدم کیا لیکن پروفیسر بکسر اور پروفیسر محمد عبدالغنی ایم۔ اے۔ ایم لٹ کے قول کے مطابق ایران میں ہمایوں سے اچھا برتاؤ نہیں کیا گیا اور اس کی وجہ دونوں کے نزدیک متضاد ہے۔

پروفیسر بکسر کے خیال کے مطابق شاہ طہماسپ صفوی کے عتاب کی وجہ یہ تھی کہ ہمایوں، طہماسپ کا ایک ماتحت امیر تھا اور طہماسپ، ہمایوں کی ناکامی پر تنبیہ کرنا چاہتا تھا۔ طہماسپ نے بارہ ہزار فوج اس غرض سے ہمراہ کی تھی کہ ہمایوں، طہماسپ کے نابالغ لڑکے شاہزادہ مراد کی ماتحتی میں سلطنت ایران کے کھوئے ہوئے صوبہ جات قندھار و کابل و دہلی پھر حاصل کرے۔ طہماسپ نے صوبہ قندھار کا حاکم ہمایوں کے بجائے بیرم خاں کو مقرر کیا تھا۔ لیکن پروفیسر صاحب نے کوئی ایسا تاریخی ثبوت پیش نہیں کیا جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ دہلی کا صوبہ برائے نام بھی سلطنت صفویہ میں شامل تھا۔

۱۔ تاریخ شاہ اسماعیل صفوی مولفہ غلام سرور ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ ڈی

۲۔ MEMOIRS OF BABUR II 94-95

۳۔ ”ہندوستان کے سکے“ مولفہ سی۔ جے براؤن۔ سکہ جرنل آف دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی ۱۹۲۴ء

۴۔ ”مغل دربار میں فارسی زبان اور ادب کی تاریخ“ حصہ دوم باب ہفتم صفحہ ۳۴۱

پروفیسر محمد عبدالغنی نے "اہل البیت ادری ہمانی البیت" کے اصول کو نظر انداز فرما کر ہمایوں نامہ مصنفہ گلبدن بیگم کے بجائے ہمایوں کے ایک ملازم جوہر کے بیان کو قیاس سمجھا ہے اور احسن التواریخ اور عالم آرائے عباسی کا کیا ذکر پروفیسر براؤن کی تاریخ ادبیات ایران کے مطالعہ کی بھی زحمت نہ گوارا فرما کر تمام مورخین کے برعکس بہرام میرزا کو شاہ طہماسپ کا بیٹا اور سلطانہ خانم کو طہماسپ کی لڑکی تصور کیا ہے! پروفیسر صاحب نے جوہر کے مندرجہ ذیل الفاظ نقل فرمائے ہیں: "علی الصباح حضرت شاہ عالم پناہ کوچ کردہ در مقام سلطانہ فرود آمدند۔ حضرت پادشاہ بسلام رفتہ بودند کہ چنداں التفات بجانب خود ندیدند کلفت خاطر کشیدند و خود را الزام کردن گرفتند کہ کاشکے (کذا فی الاصل) منی آمدم و از ہر اے ہمانی حضرت پادشاہ ہینم جمع کردہ بودند کہ حضرت شاہ گفتہ فرستادند کہ اگر در دین مادر آیند در تربیت می باشم والا بہ تمامی اہل مذہب شمارا در این ہینم آتش دادہ خواہم سوخت۔" شاہ اسماعیل صفوی کو اہل سنت سے جو بغض تھا وہ اظہر من الشمس ہے لیکن تاریخ کے صفحات شاہد ہیں کہ طہماسپ صفوی اپنے باپ کے برعکس اہل سنت کو واجب القتل نہیں سمجھتا تھا۔ عثمانی جنرل فیل پاشا کے میدان حرب سے گزرنے کے بعد یہ اطلاع موصول ہوئی ہے کہ سلطان روم فرنگستان میں مصروف حرب ہے اور ایرانی امراء بالاجماع یہ مشورہ پیش کرتے ہیں کہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ایشیائے کوچک فتح کر لینا چاہئے لیکن شاہ طہماسپ صفوی کی اسلام دوستی کا جذبہ اس کے منہ سے یہ یادگار الفاظ کہلاتا ہے: "اگر چنانچہ او برادر و فرزند مرا کشتہ باشند چوں بغضائے کفار رفتہ بالکاء او منی رویم و دین را بدینا منی فروشیم۔" اسی طرح جب ملکہ ایلزبتھ نے ترکوں کے خلاف طہماسپ صفوی کی مدد کرنا چاہی تو طہماسپ نے صاف صاف کہہ دیا "مارا ہمد کفار حاجت نیست۔"

بے شک ہمایوں نے بیرم خاں کے مشورے سے اردبیل کی زیارت بھی کی اور اظہار تشیع بھی کیا اور شاہ طہماسپ اس اظہار تشیع سے خوش بھی ہوا لیکن اس اظہار تشیع سے قبل بھی شاہ طہماسپ نے ہمایوں کے احترام میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا تھا۔ سر جان مالکم کے الفاظ میں "کوئی ایسی مثال نہیں جس میں کسی مصیبت زدہ بادشاہ کا اس شاہانہ تزک و احتشام سے استقبال کیا گیا ہو یا اس کی اتنی خاطر مدارات کی گئی ہو یا اس کی اتنی مدد کی گئی ہو۔ سلطنت کے تمام ذرائع اس جہان کے لئے وقف تھے اور اس کو دوبارہ تخت نشین کرنے کے لئے تمام ذرائع بے دریغ صرف کئے گئے۔ طہماسپ اس تعریف کا حقیقتاً مستحق تھا جو اسے دور و دراز کی اقوام کی جانب سے پیش کی گئی۔" اس حسن سلوک کا اثر ہمایوں کے پوتے جہانگیر کے عہد تک اتنا باقی تھا کہ جب سلطان روم نے اپنے ایلچی کے ذریعہ سے استدعا کی کہ وہ شاہ عباس کبیر کی دوستی سے ہاتھ اٹھائے تو جہانگیر نے اس ایلچی کے ساتھ بہت برا برتاؤ کیا اور اس کو زمیں بوس ہو کر سلام کرنے پر مجبور کیا۔ اس ایلچی کے رخصت ہونے کے فوراً بعد جہانگیر نے شاہ عباس صفوی کو ہمیش بہا تحائف روانہ کئے۔

پروفیسر بکھر کے الفاظ میں "ہند کی مسند امارت ایک دفعہ پھر ایران کا اقتدار اعلیٰ تسلیم کرنے کے لئے مجبور ہو گئی۔" اور ہمایوں کے انتقال کے بعد اکبر کی سلطنت کا انتظام خان خانان کے سپرد کر دیا گیا جو مذہباً شیعہ اور شاہ طہماسپ صفوی کا معتد علیہ تھا۔

دوسری طرف حضرت محمد جیسے بزرگوار کے خطوط میں جو انسانی خان خانان کے نام سے لکھے گئے ہیں۔

جواب شدہ تھا؟

- ۱۔ "تذکرہ شاہ طہماسپ" مطبوعہ چاپ خانہ کادیانی ص ۳۱
- ۲۔ "تاریخ ایران" مصنفہ سر جان مالکم مترجمہ میرزا اسماعیل حیرت مطبوعہ ممبئی ص ۱۸۹
- ۳۔ "تاریخ ایران" مصنفہ سر جان مالکم جلد اول ص ۵
- ۴۔ "سرطامس رود کی سفارت ہند" مطبوعہ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس ص ۹۲
- ۵۔ "جنرل آف دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی ۱۹۲۲ء

دکیل السلطنت کے خلاف ایک محاذ قائم کیا گیا اور ۱۷۵۷ء میں بیرم خاں خان خاناں اپنے عہدے سے مستعفی ہونے کے بعد ناگور کے راستے سے بارادہ جج روانہ ہوا لیکن دفعۃً بیرم خاں نے شمال کا رخ کیا اور بعض مورخین کا خیال ہے کہ شاید بیرم خاں ایران جانا چاہتا تھا، بہر حال اکبر کی فوج نے بیرم خاں کو شکست دی اور ۱۷۵۷ء میں محمد خاں افغان نے اپنے باپ کے خون کے بدلے میں بیرم خاں کو قتل کر دیا۔ بیرم خاں کے قتل کے یقین برسر کے اندر اندر اکبر نے جزیہ لینا موقوف کر دیا (۱۷۵۷ء) اور ہندو راجاؤں کو اپنا کر ایران کے اقتدار اعلیٰ سے ہمیشہ کے لئے نجات حاصل کر لی۔ اکبر ایران کے نام نہاد یا حقیقی اقتدار اعلیٰ سے تو متنفر تھا لیکن وہ سلاطین عثمانیہ کی روز افزوں طاقت سے بھی خائف تھا اور اسی وجہ سے ایرانی حکمرانوں کی بقا کا خواہش مند تھا اور بنا بریں اکبر نے اس ازبک سفیر کی ہمت افزائی نہیں کی جو سلطان مراد ثالث کے ایما سے اکبر کو ایران کے خلاف بھڑکانے کے لئے آیا تھا۔ اکبر کا دلی منشا یہ تھا کہ راجپوتوں کی وفادار فوج کے ساتھ ساتھ وہ کوئی ایسا مذہبی مسلک بھی اختیار کرے جو اسے بیک وقت ایران اور روم کی مذہبی و سیاسی قیادت سے آزاد کر دے لیکن اس کی دور اندیشی عاجلانہ اقدام کی مانع تھی اور یہی وجہ تھی کہ جب ۱۷۵۷ء میں شیخ مبارک نے مذہبی اور سیاسی خود مختاری کے اعلان کا مشورہ دیا تو (چونکہ شاہ طہماسپ صفوی زندہ تھا اور چونکہ سلطنت عثمانیہ کسی اندرونی خلفشار میں مبتلا نہیں تھی) اکبر نے انکار کر دیا۔ ہاں جب شاہ طہماسپ کے انتقال کے بعد اس کے نااہل جانشینوں (اسمعیل ثانی اور محمد خدا بندہ) کی وجہ سے ایران کی فوجی قوت کم ہو گئی اور ۱۷۵۷ء میں حاجی حبیب اللہ اور سلطان خواجہ کی زبانی سلطنت عثمانیہ کے خلفشار کا حال معلوم ہو گیا تو ۱۷۵۹ء میں وہ تاریخی خطر شائع ہوا جس کی رو سے امام عادل - امیر المومنین اور خلیفۃ اللہ بن جلال الدین محمد اکبر ایران اور روم کے مذہبی اور سیاسی اقتدار کے دعاوی سے یکسر آزاد ہو گیا اور یہی وہ پس منظر تھا جو چند سال کے بعد دین الہی کے شیوع کا باعث ہوا۔

طالب صفوی

۱۔ "جنرل آف دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی ۱۹۲۴ء - سے "دین الہی" مصنفہ کھن لال رائے چودھری منڈا - سے جنرل آف دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی

تصانیف نیاز فتحپوری

من ویزداں کامل	مذہبی استفسارات و جوابات	جمالستان	نگارستان	شہوانیات
مکتوبات نیازتین حصے	استقادیات	حسن کی عیاریاں	مالہ و ماعلیم	شہاب کی سرگزشت
فلاسفہ قدیم	مقالات نیاز	فراسات الیر	مذہب	نقاب اٹھ جانے کے بعد
جذبات بجا شاعر کا انجام				
۱۲	۱۳	۱۴	۱۵	۱۶

میزان

منیجر نگار

تمام کتابیں ایک ساتھ طلب کرنے پر معہ محصول صرف چالیس روپے میں اخیر اپریل ۱۹۷۷ء تک -

ایران

ہر قدم پر ہیں سیاہی کے فراز اور نشیب
ہے تھی نقد تجلی سے مہر کی جیب
تیری صبحوں نے دیا اپنے ہی سورج کو فریب
غم کے سانچے میں تبسم کو ڈھلا دیکھا ہے
ہم نے ببل کو نشیمن سے جدا دیکھا ہے
کنج زنداں میں مصدق کو پڑا دیکھا ہے
ریت میں کھو گئی گاتی ہوئی وہ جوئے خوش آب
زہر میں ڈوب گئی کارگہ عطر و گلاب
رہ گیا تشنہ تعبیر اک "آزاد" کا خواب
تاکجا! صبح کے عارض پہ ہند لکے کی خدائش
پھر ہے ایران کو اسی "نیر اعظم" کی تلاش

فضا ابن فضی اعظمی

غزل نفیس قادری سونگیدی :-

رہ نیا زمیں کیونکر وہ سنا دماں گزرے
جنہیں تقادل سے علاقہ نہ جسم و جاں سے لگاؤ
دل حزیں کو ترشہ اپنے کا شوق سکتا ورنہ
نئے نئے تھے مناظر جو راہ ہستی میں
ہمارے سامنے آتے ہوئے نہ شرماؤ
ابھی خیر کہ ان کا مزاج برہم ہے
حیات پاک کے جسے زندگی گواں گزرے
نظر کے ساتھ کچھ ایسے بھی امتحان گزرے ✓
وہ لاکھ بار ادھر ہو کے مہرباں گزرے
قدم قدم پہ بتنا کے کارواں گزرے
کہیں نہ دیکھنے والوں کو کچھ گماں گزرے
وہ آج ہو کے بہت مجھے بدگماں گزرے

قرآن

سنگی ہوئی سرخ بنوں کی آگ
رسالت کی منزل کا یہ سنگ میل
نگارِ بنا حیدر و مہ کا سہاگ
محمد کے اشکوں کی ٹھنڈی سبیل
یہ زمیں صحیفہ مقدس کتاب
حرم کے افق کا عظیم آفتاب

کہیں گرم ہاتھوں پہ کھلتا ہے جب
سنگی میں کیاں دہکتے ہیں پھول
دھڑکتے ہوئے دل پہ تپتا ہے جب
زر و سیم بن کر چمکتی ہے دھول
مچلتے ہیں دریا بہکتے ہیں گہیت
نکھرتے ہیں مانتے چمکتے ہیں دل
بھڑکتے ہیں آتشکدے بن کے جام
ابتلا ہے لاوا برستی ہے آگ
برستی ہے کروٹ پہ کروٹ حیات
لرزتے ہیں قدموں سے دشت چیل
ہر اک سنگ بتاتا ہے شفاف کلچر
سیلکتے ہیں زنداں گچھلتے ہیں طوق
دھڑکتا ہے ہر پھول کا پیر میں
سیفنے کناروں سے جاتے ہیں دور
چمکتا ہے فطوں سے پھولوں کا رس
نکھرتا ہے عزم و صلابت کا روپ
جھلکتا ہے ماتھوں چمکتے کا رنگ
ہواؤں میں اڑتے ہیں زمیں نشاں
نگارِ آب یہ آئینہ آفاق کا
سنگِ اک نقش ہے طاق کا

ساقی جاوید بی لے

ازل کے مصور کا نقشِ قلم
یہ نجم و شریا کی بانگ رحیل
یہ گرمی انجیل و قلب زبور
یہ نقاشِ مہتی کے فن کا کمال
ازل کے یہ پھولوں کا میٹھا ورق
دھڑکتا ہوا قلب مہتی کا راز
چمکتا ہوا زندگی کا اصول
محبت کا دل اتھا کا دماغ
یہ دنیا میں رحمت کے پانی کی جھیل
یہ باطل سے قدرت کا اعلان جنگ
یہ سونے کے الفاظ چاندی کے بول
یہ نبضِ تقدس یہ روحِ حرم
یہ فطرت کے ماتھے کا خطِ جمیل
یہ طوفانِ رحمت یہ سیلابِ نور
تجلی کا دامِ اُجالوں کا جال
یہ تاریخِ نجم و قمر کا ورق
یہ حور وں کا نغمہ فرشتوں کا ساز
یہ کوثر کا دھارا یہ جنت کا پھول
یہ راہِ ہدایت کا جلتا چراغ
یہ نقش و نگار پر جبریل
یہ مہتی کے رخ پر حقیقت کا رنگ
یہ حور کی قیمت ستاروں کا مول

یہ روحِ محمد یہ قلبِ حسین
یہ گم کی صبح اور مدینہ کی شام
چمکتی ہوئی ایک قوسِ قزح
وہ صہبا کہ دھل جائے جیسے شکوک
ستاروں سے کھینچی ہوئی یہ شراب
کسی کے چراغِ جبین کی یہ نور
یہ قدرت کا تعمیر کردہ حرم
کسی کے یہ رخ کا اٹھنا آفتاب
دہکتا ہوا رطل پر ایک طور
چمکتا ہوا وقت کا عطر دان
یہ شمعِ حرا یہ چراغِ حنین
یہ شرابِ منورہ کا رنگین مہام
یہ قدرت کی انگڑائیوں کا قدح
یہ فطرت کے بیتاب سینے کی ہوک
یہ چشمِ حقیقت کا رنگین خواب
یہ بغاوت کا سیل انقلاب کی رو
یہ عزم و صلابت کا سنگِ عظیم
یہ راہِ قمرِ بادہ آفتاب
یہ طاقِ تجلی یہ محرابِ نور
زمیں پر یہ اثری ہوئی کہکشاں

رباعیات رضوی

بیگانہ بھی سن لے آشنا بھی سن لے
فریاد نہ کر خودی کو رسوا کر کے
اس طرح نہ رو کہ دوسرا بھی سن لے
حاصل نہیں کچھ اگر خدا بھی سن لے
اب تک اپنی ہی نظر سے پنہاں
وہ پھول کھلا کہ جس میں تہہ اندر تہہ
باقی ہیں ہزار ناشگفتہ کیاں

مکتوباتِ نیاز

(دین حصول میں)

یہ نگار کے تمام وہ خطوط جو جذبات ری، سلاست بیان، رنگینی اور میلے پن کے لحاظ سے فن انشاء میں پہلی چیز میں اور جن کے سامنے موط غالب بھی کھیکے معلوم ہوتے ہیں ایڈیشنوں میں پہلے ایڈیشن کی لیبوں کو دور کیا گیا ہے اور ۲۸ پونڈ کاغذ پر طاعت ہوئی ہے۔
ت ہر حصہ کی چار روپیہ علاوہ محصول

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عظیم النظر افسانہ جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے اس کی زبان و تخیل، اس کی نزاکت بیان اس کی بلندی مضمون اور اس کی انشاء عالیہ بحر حلال کے درجہ تک پہنچتی ہے۔ یہ ادیشن نہایت صحیح اور خوش خط ہے۔
قیمت دو روپیہ
علاوہ محصول

جذباتِ بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کر کے ان کی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے، اردو میں یہی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے جس میں ہندی شاعری کے بے مثل نمونے نظر آتے ہیں۔
قیمت بارہ آنے
علاوہ محصول

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے مفتوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اس کے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں، یہ افسانہ اپنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی تازہ ادیشن نہایت صحیح و خوش خط سردرت نگین
قیمت بارہ آنے
علاوہ محصول

فلاسفہ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے دو علمی مضامین شامل ہیں۔
(۱) چند گھنٹے فلاسفہ قدیم کی روجوں کے ساتھ۔
(۲) مادیین کا مذہب۔ نہایت مفید اور دلچسپ کتاب ہے۔
قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

فراست البید

مؤلفہ نیاز فتحپوری۔ اس کے مطالعہ سے ایک شخص انسانی ہاتھ کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یاد دوسرے شخص کے مستقبل، سیرت عروج و زوال، موت و حیات، صحت و بیماری، ثمرت و نیک نامی پر صحیح پیش گوئی کر سکتا ہے۔
قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

نائب جانیکے بعد

ز فتحپوری کے تین افسانوں کا مجموعہ جس میں بتایا گیا ہے کہ ہمارے کے بادیان طریقت و علمائے کی اندرونی زندگی کیا ہے ان کا وجود ہماری معاشرت کی حیات کے لئے کس درجہ اہم ہے، زبان، پلاٹ و انشاء لحاظ سے جو مرتبہ ان افسانوں کا بہترین دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔
ت اکٹھا آنے علاوہ محصول

انتقادیات

حضرت نیاز کے انتقادی مقالات کا مجموعہ فہرست مضامین یہ ہے ایران و ہندوستان کا اثر جرمن شاعری پر فارسی زبان کی پیدائش پر مورخانہ نظر اور دو شاعری پر تاریخی تبصرہ، اردو غزل گوئی کی عہد بہ عہد ترقی نقشبائے رنگ نگار کی فارسی غزل گوئی پر تبصرہ ادبیات اور اصول نقد فنون ادبیہ و حقیقت نگاری قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

مذہب

حضرت نیاز کا وہ معرکہ آرا مقالہ جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ مذہب کی حقیقت کیا ہے اور دنیا میں یہ کیوں کر رائج ہوا، اس کے مطالعہ کے بعد انسان خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ مذہب کی پابندی کیا معنی رکھتی ہے۔
قیمت ایک روپیہ
علاوہ محصول

نگار کے خاص نمبر

فروری، مارچ

۱۹۴۶ء

جو فن انتقاد پر ملک کے بہترین اہل قلم اور
ارباب فکر کے مضامین پیش کرتے ہیں۔
قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری ۱۹۴۳ء

اس نمبر میں ریاض خیر آبادی مرحوم کے کلام
پر ملک کے متعدد مشاہیر نے نقد و تبصرہ کر کے
بتایا ہے کہ ریاض کی شاعری کیا تھی۔
قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

سالنامہ ۱۹۴۸ء

دعوتِ نمبر جو ختم ہو چکا تھا اور جس کی مانگ
بہت زیادہ تھی۔ دوبارہ شائع کیا گیا ہے
مومن کے مطالعہ کے لئے اس کا پڑھنا از بس
ضروری ہے۔ قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری، فروری ۱۹۴۹ء

نگار کا افسانہ نمبر جس میں تقریباً تیس افسانے بہترین اہل قلم کے شائع
کئے گئے ہیں۔ اس سالنامہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے مطالعہ سے بڑی
معلوم کیا جاسکتا ہے کہ افسانہ نگاری کے کتنے اسکول ہیں اور ہر اسکول
کا کیا ریاضی فسانہ کیا ہونا چاہئے۔ قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری، فروری ۱۹۴۸ء

پاکستان نمبر نگار کا جو ملی نمبر جس میں دنیا کے سامنے اسلام کی عظمت
اور تمدن اسلام کے بلند حقائق کو پیش کیا گیا ہے تاکہ مسلمان اپنے مستقبل کی
تعمیر کے وقت اسلام کے دورِ زریں کو نہ بھول جائے جس پر مسلم حکومت
کی ترقی کی بنیاد قائم ہوئی تھی۔ قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

جنوری، فروری ۱۹۵۱ء

اس سالنامہ کے دو حصے ہیں پہلے حصے میں مارس ہنڈس کی مشہور عالم کلام
ایک مستقبل کشاں کا ترجمہ و اقتباس ہے جس میں اس نے ایران، عراق
فلسطین وغیرہ ممالک اسلامی کی سیاست کے بعد وہاں کی موجودہ اقتصادی
زبوں حالی اور ان کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے اور اسی کے ساتھ
بھی بتایا ہے کہ ان کا مستقبل کتنا روشن ہے اگر وہ ترقی کے صحیح راستے پر
لیں۔ سالنامہ کا دوسرا حصہ ڈیٹرنگار کے قلم کا ہے جس میں پہلی جنگ کے
مسلم حکومتوں کے انقلاب کی تاریخ اور اس کے اسباب کو غور کیا گیا ہے قیمت دو روپیہ

جنوری، فروری ۱۹۵۰ء

نگار کی ۲۵ سالہ ادبی و تنقیدی خدمات کا بخور جس میں ۱۹۲۵ء
سے لے کر ۱۹۴۹ء تک کے تمام تنقیدی رجحانات و انتقادی
نمونوں کو واضح کیا گیا ہے اس میں بعض ایسے اکابر و شعراء کا تذکرہ
و انتخاب کلام بھی شامل ہے جن کے حالات عام طور پر معلوم نہیں
ہیں۔ اور جن کا کلام نایاب ہے۔ اس میں جدید تنقیدی میلانات
اور ترقی پسند نقادوں کے مقالات بھی شامل ہیں۔
قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

سالنامہ ۱۹۵۴ء

دفرانہ طایان اسلام نمبر، پانچ اسلامی کانجڑ ہے جس میں
ولادت نبوی سے لے کر اس وقت تک کی تمام مسلم
حکومتوں کے شجرے لے کر ان کے اسباب عروج
و زوال کو بتایا گیا ہے۔ یہ سالنامہ درس ایک
تاریخی کتاب ہے جو ہر کھمبے کے پاس ہونا چاہئے
قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

سالنامہ ۱۹۵۳ء

داع نمبر جس میں داع کے سوانح حیات کے
بہت سے وہ پہلو پیش کئے گئے ہیں جو اس وقت
تک سامنے نہ آئے تھے اس نمبر میں قیام راجپوت قیام
حیدر آباد کے زمانہ کے علاوہ ان کی حیاتِ عاشقینہ بھی
روشنی ڈالی گئی ہے اور ان کے فنِ شعر کوئی ہر ملک کے
مشہور نقادوں نے اظہارِ خیال کیا ہے قیمت دو روپیہ

سالنامہ ۱۹۵۲ء

احسرت نمبر جس میں ملک کے تمام اکابر نقاد
ادب نے حصہ لیا ہے اور انتخاب کلام احسرت اس
انما سے کیا گیا ہے کہ آپ کو کلیات احسرت کے دیکھنے
کی ضرورت نہ ہوگی احسرت کی شاعری کا مرتبہ علوم
کے لئے اس کا مطالعہ از بس ضروری ہے
قیمت دو روپیہ علاوہ محصول